May 1998 • No. 258 • Rs. 8

نہ پائے ہوئے پر دھیان دینے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے

اور پائے ہوئے پر دھیان دینے سے حوصلہ مندی
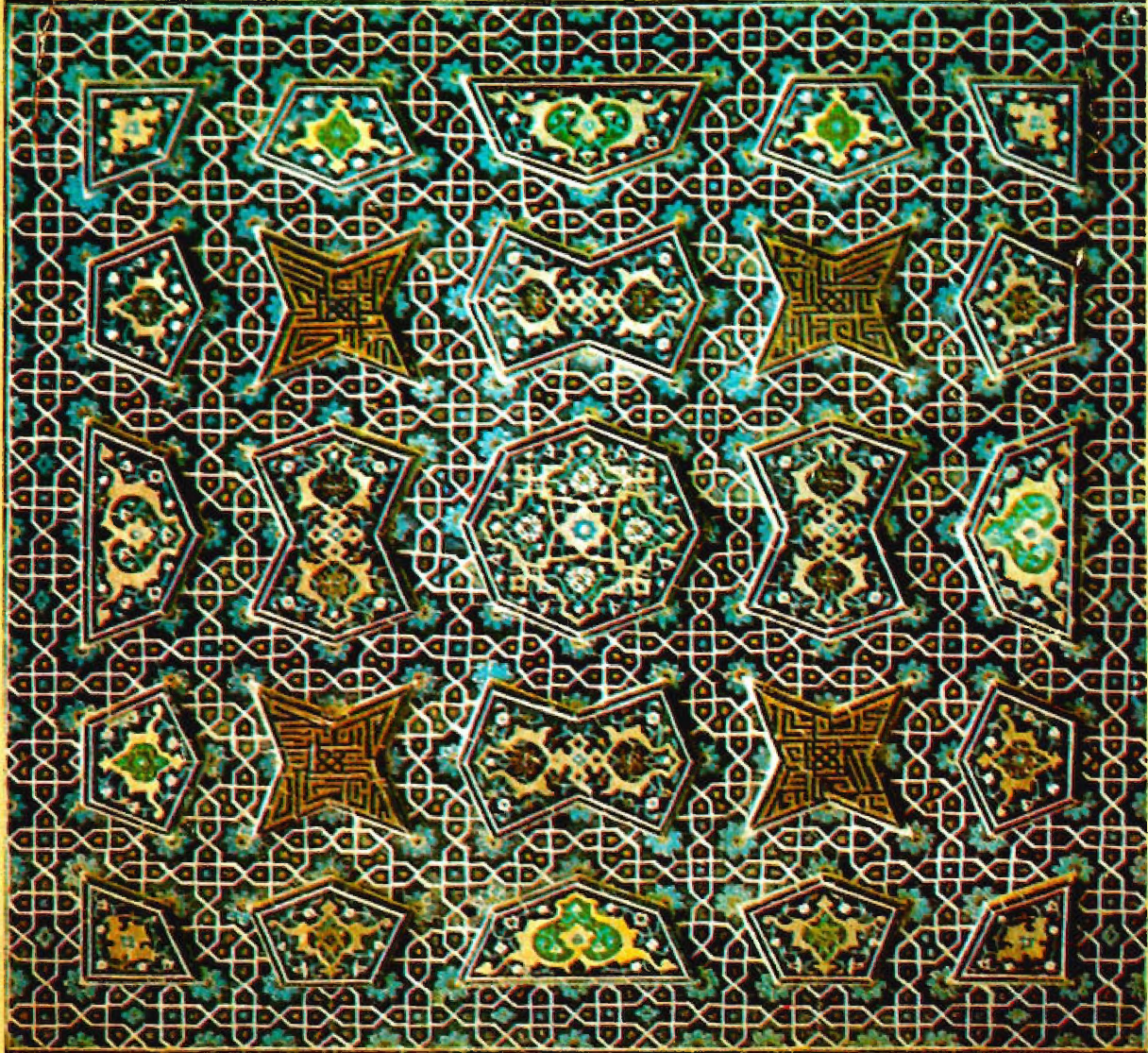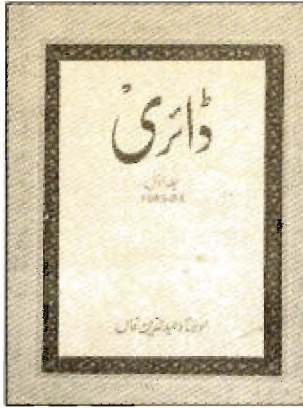
Size 22×14.5cm,
400 pages
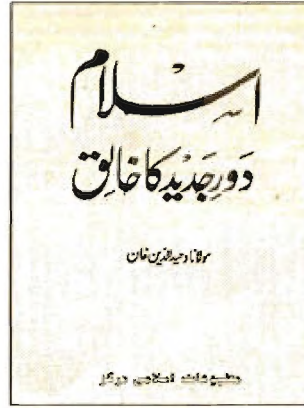
Size 22×14.5cm,
112 pages
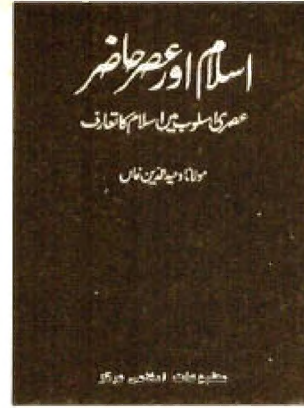
Size 22×14.5cm,
144 pages
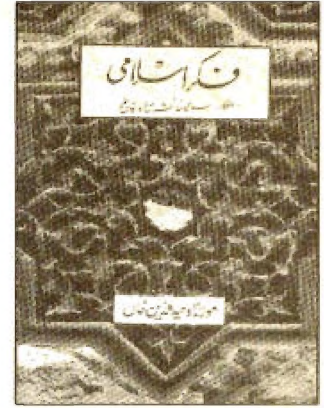
Size 22×14.5cm,
340 pages
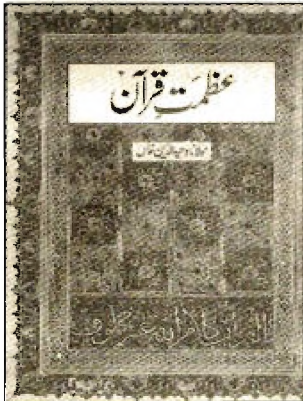
Size 22×14.5cm,
152 pages
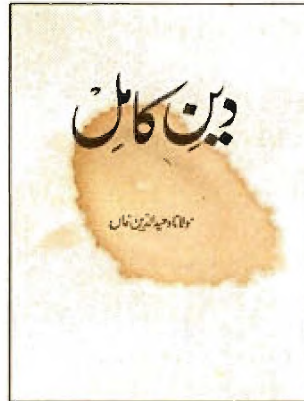
Size 22×14.5cm,
368 pages
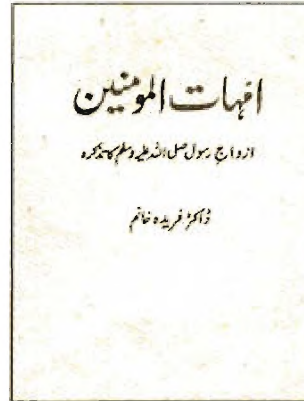
Size 22×14.5cm,
56 pages

Size 22×14.5cm,
172 pages
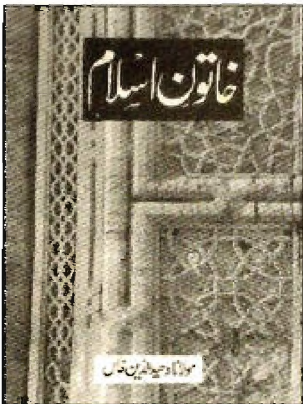
Size 22×14.5cm,
288 pages
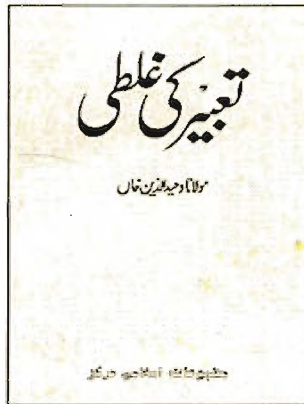
Size 22×14.5cm,
344 pages
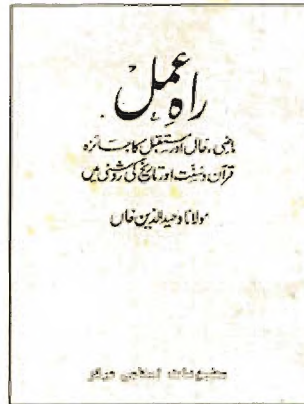
Size 22×14.5cm,
152 pages

Size 22×14.5cm,
128 pages

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مئی ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۸

اسلامی مشورہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ لو (وشاورھم فی الامر، آل عمران ۱۵۹) دوسری جگہ عام مسلمانوں کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں (وامرھم شوری بینھم، الشوری ۳۸)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے مشورہ کرتا ہو (ما رأیت رجلاً اکثر استشاراً للرجال من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، التفسیر المظہری)
اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ میں نے کسی کو اصحاب رسول سے زیادہ مشورہ کرنے والا نہیں پایا (ما رأیت احداً اکثر مشاورۃ من اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیر الکشاف)

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ جب بھی کوئی گروہ مشورہ سے کام کرتا ہے تو وہ ضرور صحیح ترین رائے تک پہنچ جاتا ہے (ما شاور قوم قط الا ھُدُوا لارشد امور ھم، صفوۃ التفاسیر) ۲۴۷/۱

مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ مختلف لوگوں کی معلومات اور ان کے تجربات کو حاصل کیا جائے اور پھر ان کی روشنی میں زیر بحث معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر مشورہ دینے والے سنجیدہ ہوں، اور مشورہ لینے والے حق پسند ہوں تو مشورہ اتنا مفید ثابت ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں۔ مشورہ امکانی نقصانات سے بچنے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہے۔

مشورہ دینے والے کو چاہیے کہ جو کچھ بولے سوچ کر بولے، اور اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ کرے۔ مشورہ لینے والے کو چاہیے کہ وہ کسی بات کو وقار کا مسئلہ نہ بنائے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف بات کہے تب بھی اس کو خالی الذہن ہو کر سنے۔ حتی کہ کوئی شخص سخت انداز میں تنقید کرے، تب بھی اس کے الفاظ یا لہجہ کی سختی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی اصل رائے پر غور کرے۔

اگر مشورہ دینے والے اور مشورہ لینے والے دونوں مشورہ کے ان آداب کو سمجھیں اور ان کو پوری طرح ملحوظ رکھیں تو ہر مشورہ لازمی طور پر مفید ثابت ہوگا اور صحیح فیصلہ تک پہنچانے والا بن جائے گا، فرد یا ادارہ کے معاملہ میں بھی اور پوری قوم کے معاملہ میں بھی۔

مشورہ ایک اسلامی طریقہ ہے۔ مشورہ کامیابیوں کا زینہ ہے۔

حسرت کا عذاب

موجودہ زندگی میں سب سے بڑا عذاب حسرت کا عذاب ہوتا ہے۔ آدمی کسی قیمتی موقع کو کھو دے تو اس کو سوچ کر ہمیشہ آہیں بھرتا ہے۔ کھوئے ہوئے مواقع کا غم کبھی آدمی کے سینہ سے نہیں نکلتا۔ غالباً یہی معاملہ آخرت میں بھی ہوگا۔ آخرت کی دنیا میں بھی کسی انسان کے لئے سب سے بڑا عذاب غالباً حسرت کا عذاب ہوگا۔ موجودہ دنیا کے کھوئے ہوئے مواقع اس کے اوپر تلخ یاد بن کر مسلط ہوجائیں گے۔ یہ ایک ناقابل برداشت غم ہوگا جس سے آدمی کبھی نجات نہ پاسکے گا۔

آدمی کی موجودہ عمر جب ختم ہوجائے گی اور وہ ہمیشہ کے لئے آخرت کی دنیا میں پہنچ جائے گا تو اس کو ایک ایک کرکے وہ لمحات یاد آئیں گے جو موجودہ دنیا میں اس کے ساتھ گزرے تھے۔ مگر اس نے اُن لمحات کو نظر انداز کیا۔ ان کو وہ اپنے اعمال نامہ کا حصہ نہ بنا سکا۔

وہ کرب ناک احساس کے ساتھ سوچے گا کہ کیسے کیسے قیمتی مواقع مجھے ملے تھے جب کہ میں ایک عمل کا ثبوت دے کر یہاں خدا کی رضا جیسی نعمت کو پاسکتا تھا۔ مگر میری بھول نے مجھ کو محروم رکھا۔ میں اس قیمتی موقع کو استعمال نہ کرسکا۔ خدا نے مجھے ایک شاندار امکان کے کنارے پہنچایا مگر اس امکان کو میں اپنے لئے واقعہ نہ بنا سکا۔

میرے سامنے فلاں صداقت ظاہر ہوئی مگر میں اس کے حق میں اعتراف کا کلمہ نہ بول سکا۔ فلاں موقع پر میں نے حق کو مظلوم ہوتے ہوئے دیکھا مگر میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ فلاں بندۂ خدا کا فلاں حق میرے ذمہ تھا مگر میں اس کو اس کا حق لوٹانے پر راضی نہ ہوا۔ فلاں موقع پر میرے دل کی دھڑکنوں نے تیز ہوکر مجھے الارم دیا تھا مگر اس خدائی الارم کو سُن کر میں نے اسے بھلا دیا۔ فلاں ٹھوکر نے مجھے انتباہ دیا تھا کہ تم غلط راستہ پر جارہے ہو مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی اور بدستور اسی غلط راستہ پر چلتا رہا۔

عمل کی دنیا سے نکل کر جب آدمی نتیجۂ عمل کی دنیا میں پہنچے گا تو اس قسم کی بے شمار باتیں اسے یاد آئیں گی۔ وہ آہوں کی زبان میں سوچے گا کہ دنیا کے ان مواقع کو اگر میں استعمال کرتا تو اب آخرت کے عالم میں کتنے بڑے خیر کا مالک بن سکتا تھا۔ مگر ان مواقع کو برباد کرکے میں نے اپنی زندگی کو برباد کر دیا۔ یہ مواقع اب ابدی طور پر مجھ سے کھوئے جاچکے ہیں۔ اس لئے اس کا برا انجام بھی اب ابدی طور پر مجھے برداشت کرنا ہے۔

قانون ہشت

اگر آپ ایک چوکور کاغذ کو لیں اور اس کو موڑنا شروع کریں تو آپ صرف آٹھ موڑ تک اس کو موڑ پائیں گے۔ اس کے بعد نواں موڑ یا دسواں موڑ آپ کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اصول ہر حال میں درست ہے خواہ آپ کا کاغذ پوسٹ کارڈ کے برابر ہو یا روزانہ اخبار کے برابر یا کسی بہت بڑے پوسٹر کے برابر۔ ہر حال میں آپ کا موڑ آٹھ پر جا کر رک جائے گا۔ اس کے آگے وہ نہیں بڑھے گا۔

یہ قانون ہشت (آٹھ کا قانون) ہے۔ یہ فطرت کا قائم کردہ ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں مانع قوانین موجود ہیں جو کسی کی سرگرمیوں کو ایک حد پر جا کر روک دیتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے طاقتور کے لیے بھی اس حد بندی کو توڑنا ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ایٹم بم صرف ایک بار گرایا جاسکتا ہے، بار بار ایٹم بم گرانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس دنیا میں ایک شخص ظالمانہ الفاظ بولنے کے لیے آزاد ہے مگر اپنے ظالمانہ الفاظ کو واقعہ بنانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ کوئی شخص ایک عبادت خانہ کو ڈھا سکتا ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ سارے ہی عبادت خانوں کو ڈھادے۔ ایک شخص منفی نعرے لگا کر اقتدار تک پہنچ سکتا ہے مگر کوئی بھی اقتدار اس کے لیے کافی نہیں کہ وہ اپنے نعروں کو تاریخ کا درجہ دے دے۔

فطرت کا یہ اٹل قانون اس دنیا میں ہر انسان کے لیے امن اور تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ جب تک یہ دنیا موجود ہے اس کا یہ قانون بھی لازمی طور پر موجود رہے گا۔ فطرت کا یہ قانون صرف اس وقت ختم ہوگا جب کہ خود یہ دنیا ہی ختم ہو جائے اور کوئی شخص یہاں باقی ہی نہ رہے جو ظالمانہ الفاظ بول کر لوگوں کو ڈرائے یا مفسدانہ منصوبہ بنا کر لوگوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا کرے۔

فطرت کا یہ ناقابل تغیر قانون اپنی خاموش آواز میں کہہ رہا ہے کہ اے لوگو، تم اپنے آپ کو خود اپنے ظلم سے بچاؤ۔ کیوں کہ تم سے باہر کوئی بھی نہیں جو تم کو اپنے ظلم و فساد کا نشانہ بنا سکے۔

اسی قانون ہشت کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ یعنی روک کا قانون، جو ہر چیز کو ایک متعین حد پر رہنے کے لیے مجبور کر دے۔

کسب اور وہب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ یہ ایک سادہ اور واضح بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے منتخب پیغمبر کو براہ راست علم حقیقت عطا کیا۔ اور بقیہ لوگوں کے لئے پیغمبر کو اس کے حصول کا ذریعہ بنا دیا۔ پیغمبر نے جو عمل بلاواسطہ خدائی حکم کے تحت کیا، اسی کو ہمیں پیغمبرانہ تقلید کے طور پر بالواسطہ انداز میں انجام دینا ہے۔

مگر کچھ لوگوں نے اس سیدھی اور صاف بات میں گمراہی ملا دی۔ انھوں نے کہا کہ جو چیزیں پیغمبر کے لئے قابل حصول تھیں وہ سب کی سب ہمارے لئے بھی قابل حصول ہیں۔ اللہ سے مکالمہ، فرشتہ سے براہ راست ملاقات، غیب کی خبروں پر اطلاع، وغیرہ۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ کو جب قرآن نے اسوہ قرار دیا ہے تو وہ کلّی اعتبار سے ہمارے لیے اسوہ قرار پائیں گے نہ کہ صرف جزئی اعتبار سے۔ چنانچہ اکثر صوفیاء کسی نہ کسی طور پر یہ کہتے ہیں کہ عبادت و ریاضت کے ذریعہ انسان تمام کمالاتِ نبوت تک پہنچ سکتا ہے۔ اگرچہ اب کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو منصبِ نبوت پر فائز ہونے کا دعویٰ کرے۔

یہ بلاشبہ گمراہی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اسوۂ نبوت کسب میں ہے، وہب میں نہیں۔ کسی آدمی کا پیغمبر یا مُلہَم ہونا سراسر ایک وہبی چیز ہے۔ اس معاملہ میں کوئی پیغمبر کسی کے لئے نمونہ نہیں۔ البتہ پیغمبر کے اعمال و کردار کسبی ہوتے ہیں، اسی دوسرے اعتبار سے وہ ہمارے لئے نمونہ ہے۔

ایک ہے علم دین، اور دوسری چیز ہے کیفیات دین۔ علم دین کے معاملہ میں پیغمبر ایک مستثنیٰ شخصیت ہوتا ہے۔ مگر کیفیات دین میں ہر آدمی اپنی محنت کے بقدر حصہ پاتا ہے۔ جو آدمی تذکر اور تفکر کا طریقہ اختیار کرے گا اس کو ازدیاد ایمان کی نعمت ملے گی۔ جو آدمی سچا سجدہ کریگا اس کو اپنی صلاحیت کے بقدر خدا کی قربت کا تجربہ ہوگا۔ جو آدمی زہد اور دنیا سے بے رغبتی کی زندگی گزارے گا اس کے دل میں حکمت و بصیرت کا انبات ہوگا۔ جو آدمی اپنی ساری توجہ اللہ میں لگا دے گا اس پر اللہ کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ جو آدمی حقیقی معنوں میں صبر و تقویٰ کا ثبوت دے گا وہ ضرور نصرت خداوندی میں اپنا حصہ پائے گا۔

ذاتی نمائش

ایک مسلمان کمانے کے لیے باہر گیے۔ وہ تعلیم یافتہ تو نہ تھے، تاہم باہر انھیں کوئی اچھا کام مل گیا۔ انھوں نے کافی پیسہ کمایا۔ وہ عید کے موقع پر گھر آئے تو انھوں نے مجھے بھی خصوصی طور پر اپنے یہاں عید کے دن آنے کی دعوت دی۔ میں گیا۔ سوئیاں لائی گئیں۔ میں نے دیکھا تو اس کے اوپر سونے کا ورق لگا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس طرح تو چاندی کا ورق لگانا بھی بے کار ہے۔ پھر انھوں نے سونے کا ورق کیوں لگا دیا ہے۔ آخر کار سمجھ میں آیا کہ اس کے پیچھے ذاتی نمائش کا جذبہ تھا۔ چاندی کے ورق کے عمومی استعمال کی وجہ سے اس کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ اس لیے انھوں نے سونے کا ورق لگایا تاکہ ذاتی نمود و نمائش کا مقصد پورے طور پر حاصل ہو۔

ذاتی نمائش کا جذبہ آدمی کا سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ ہے۔ یہ جذبہ جاہلوں کے اندر بھی ہے اور عالموں کے اندر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاہلوں کا جذبہ کثیف انداز میں ظاہر ہوتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کا جذبہ لطیف انداز میں۔

ذاتی نمائش کا جذبہ بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ حتی کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ میں سونے اور چاندی کے سکوں میں بکنے والا نہیں، مگر عین اسی وقت وہ نمود و نمائش اور شہرت و عزّت کے سکّوں میں بکا ہوا ہوتا ہے۔ آدمی بظاہر خاکساری کا مظاہرہ کرتا ہے، مگر اس کی خاکساری صرف اظہار خویش کی بدلی ہوئی صورت ہوتی ہے۔ حتی کہ وہ عبادت کرتا ہے۔ وہ مال خرچ کرتا ہے۔ وہ لڑ کر اپنی جان دیدیتا ہے مگر ان سب کے پیچھے بھی حقیقۃً ذاتی نمائش کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں ساری اہمیت صرف نیت کی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ آخری حد تک اپنی نیت کو پاک رکھنے کی کوشش کرے۔ جو کچھ کرے صرف اللہ کے لیے کرے۔ جب بھی کسی عمل کے دوران اس کے اندر ذاتی نمائش کا جذبہ آجائے تو وہ اس کو شیطان کا وسوسہ سمجھتے ہوئے اللہ سے استغفار کرے۔ یہی نجات کا واحد راستہ ہے۔

دھوم کے باوجود

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ انھوں نے کروروں آدمیوں کو متاثر کیا اور اپنے دعوے کے مطابق ان کو دین دار بنایا۔ مگر ان مسلمانوں کو حتی کہ ان کے اکابر کو قریب سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں مظاہر دین کی تو بہت دھوم ہے، مگر حقائق دین کا کہیں وجود نہیں۔

مثلاً ان کے یہاں خدا کے نام کا لفظی ورد ہے مگر خدا کی عظمتوں کا معنوی چرچا نہیں۔ رسول کی شان میں نظم و نثر کے قصیدے پڑھے جارہے ہیں، مگر رسول کی حقیقی اطاعت سے کوئی دل چسپی نہیں۔ قرآن کی قرأت کی آوازیں گونج رہی ہیں مگر قرآن پر تدبّر کرنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ اسلام کی شریعت کو دنیا میں نافذ کرنے پر تقریریں ہو رہی ہیں مگر اسلام کی شریعت کو اپنانے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ مظاہر شرک کے خلاف جہاد کیا جارہا ہے مگر حقیقت توحید کو دلوں میں اتارنے کی کسی میں تڑپ نہیں۔ اسلام کی اخلاقی خوبیاں بتا کر فخر کیا جارہا ہے۔ مگر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے کی کسی کو فرصت نہیں۔ مناظرہ بازی کے معرکے گرم ہیں مگر دعوت رب کی ناصحانہ مجالس نہیں۔

اس کی کیا وجہ ہے کہ اسلام کے مظاہر لوگوں کے اندر جاگے ہیں مگر اسلام کی حقیقت لوگوں کے اندر نہیں جاگی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی تحریکوں نے مظاہر اسلام کو زندہ کرنے پر محنت کی۔ انھوں نے حقیقت اسلام کو زندہ کرنے پر محنت ہی نہیں کی۔

اسلام کے احیار کا کام در اصل ایمان باللہ کے احیار کا کام ہے۔ اسی سے تمام اسلامی تقاضے ظہور میں آتے ہیں۔ مگر یہی وہ کام ہے جو موجودہ زمانہ کی تحریکوں نے سرے سے انجام نہیں دیا۔ آپ موجودہ زمانہ میں چھپنے والی کسی اسلامی کتاب کو پڑھئے۔ موجودہ زمانہ میں ہونے والے کسی مسلم اجتماع میں شرکت کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کہیں بھی اللہ کی عظمت کا چرچا نہیں۔ کہیں بھی اللہ کی بڑائی کو دلوں میں اتارنے والی باتیں نہیں۔ کہیں بھی اللہ کے جلال و جمال کا وہ تذکرہ نہیں جو فطرت انسانی کو جگائے اور دلوں میں ربّانی زلزلہ پیدا کرکے انسان کو اللہ والا انسان بنادے۔

جلسوں میں خداوند ذوالجلال کا تذکرہ نہیں۔ کتابوں میں عظمتِ خداوندی کا بیان نہیں۔ ایسی حالت میں یہی ہوگا کہ اسلام کے مظاہر زندہ ہوں گے، مگر اسلام کی حقیقت زندہ ہونے سے رہ جائے گی۔

جھوٹی ہوشیاری

لطیفہ ہے کہ ایک دیہاتی آدمی نے روزہ رکھا۔ دوپہر تک اس کو پیاس لگ گئی۔ جب پیاس نے زیادہ ستایا تو اس نے چاہا کہ چھپ کر پانی پیے۔ وہ روزانہ ندی پر نہانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ چھپ کر پانی پینے کی سب سے بہتر جگہ ندی ہے۔

وہ نہانے کے لیے ندی کی طرف گیا۔ ڈبکی لگا کر جلدی جلدی پانی پینے لگا۔ عین اسی وقت ایک کانٹے دار مچھلی اس کے منھ میں داخل ہوگئی۔ مچھلی کا کانٹا آدمی کی حلق میں پھنس گیا۔ وہ روتا چلّاتا ہوا ندی سے باہر نکلا۔ اس کی ہوشیاری اس کے لیے الٹی پڑی۔ لوگوں نے اور بھی زیادہ جان لیا کہ اس نے ندی میں ڈبکی لگا کر پانی پیا ہے۔ حلق میں کانٹے دار مچھلی کے پھنسنے کی مصیبت اس کے علاوہ تھی۔

دنیا میں اکثر لوگ اسی قسم کی جھوٹی ہوشیاری میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ ایک غلط مقصد حاصل کرنے کے لیے ہوشیاری کا جال بچھاتے ہیں۔ مگر خدا کا قانون ان کے سارے تانے بانے کو بکھیر دیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو اس حال میں پاتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور بدنامی کی سیاہی مزید ہوتی ہے جو ان کو ہمیشہ کے لیے روسیاہ کرکے رکھ دیتی ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسند بنے۔ وہ جو کچھ حاصل کرے جائز حدود میں رہ کر حاصل کرے، ناجائز حدود میں داخل ہوکر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کرے۔

جو لوگ بظاہر دین کا حلیہ بناتے ہیں، مگر دینی حلیہ کے پردہ میں دنیاداری کے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثال مذکورہ دیہاتی جیسی ہے۔ ان کے اس کھیل کا حال یقیناً کھل کر رہے گا، اگر دنیا میں نہ کھلا تو آخرت میں تو بہرحال اس کو کھلنا ہے۔ اور آخرت کا کھلنا، بلاشبہ، دنیا میں کھلنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے معاملہ کو ہمیشہ صاف رکھے۔ کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی اقدام نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی حد کے اندر باقی رکھے، اپنی واقعی حد سے تجاوز کرنے سے بچتا رہے۔ خدا نے اس کو جائز طور پر جو کچھ دیا ہے، اس پر قانع رہ کر زندگی گزارے۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ دنیا میں بھی کامیاب رہے گا اور آخرت میں بھی کامیاب۔

بے قیمت الفاظ

آپ بینک کے ذریعہ کسی شخص کو کچھ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو آپ اتنی ہی رقم کا ایک چک دیتے ہیں۔ یہ چک صرف اس وقت کار آمد ہے جب کہ بینک کے یہاں آپ کے کھاتہ میں اتنی مقدار میں رقم موجود ہو جتنی آپ نے چک کے کاغذ پر لکھی ہے۔

اگر بینک کے یہاں آپ کے کھاتہ میں ضروری رقم نہ ہو اور آپ کسی کو چک لکھ کر دے دیں تو ایسے چک کی کوئی قیمت نہیں۔ کیوں کہ اس چک کی بنیاد پر بینک رقم کی ادائگی نہیں کرے گا۔ آپ کا اس قسم کا چک صرف ایک بے قیمت کاغذی پرزہ ہے نہ کہ فی الواقع بینک چک۔ ایسے چک کو بینک کی اصطلاح میں بے کار چک (Dud cheque) کہا جاتا ہے۔

جب آپ کسی سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ آپ کے بارے میں کوئی امید قائم کرے تو گویا آپ اس کو اپنا ایک چک دیتے ہیں۔ ایسے چک کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ آپ کے الفاظ کو وہ عمل کے وقت کیش کرا سکے۔ اگر ایسا ہو کہ عمل کا وقت آنے پر آپ اپنے قول کے تقاضے پورے نہ کریں تو گویا کہ آپ نے اپنے بھائی کو ایک بے کار چک دے دیا۔ آپ اس سے ایسے الفاظ بولے جن کے پیچھے آپ کے اخلاقی کھاتے میں عمل کی ضروری مقدار موجود نہ تھی۔

کسی قوم پر جب زوال کا وقت آجائے تو اس کا ہر فرد اسی قسم کے بے کار چک تقسیم کرنے کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ اب ہر شخص ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جس کے بارہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق اس کے اندر یہ مضبوط ارادہ موجود نہیں ہوتا کہ وہ ان الفاظ کو عمل کی صورت میں پورا کرے گا۔

اس قسم کی لفظی فیاضی قرآن کی اس آیت کی مصداق ہے کہ وہ اپنی زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں (آل عمران ۱۶۷) یعنی ایسے لوگ بظاہر بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں مگر وہ اپنے بول میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ان کے اندر یہ پختہ ارادہ نہیں ہوتا کہ انھیں اپنے ان الفاظ کو عملاً پورا کرنا ہے۔ وہ صرف کہنے کے لیے کہہ دیتے ہیں، وہ کرنے کے لیے نہیں کہتے۔

اس روش کو قرآن میں منافقین کا طریقہ بتایا گیا ہے اور منافقین کے بارے میں قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہ آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے (النساء ۱۴۵)

قیامت پھٹ پڑے گی

وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ اس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہونچائی۔ مگر وہ کمزور تھا۔ اس کی پشت پر کوئی جتھا نہیں تھا۔ اس کی کمزوری نے لوگوں کو اس کے خلاف ڈھیٹ بنا دیا۔ اس کے پڑوسیوں نے اس کو ستایا۔ اس کے بڑوں نے اس کو ذلیل کیا۔ کسی نے اس کی عزت پر حملے کیے۔ کسی نے اس کے اوپر جھوٹے مقدمے قائم کیے۔ کسی نے اس کی معاشیات کو اجاڑنے کی اسکیم بنائی۔ کسی نے اس کو گھر سے بے گھر کرنے کی کوشش کی۔ ہر ایک اس کے معاملہ میں دلیر بن گیا۔

اس نے لوگوں کو مدد کے لیے پکارا۔ مگر کوئی نہ تھا جو اس کی مدد کے لیے دوڑے۔ وہ لوگ جو انسانیت کو بچانے کے لیے بڑی بڑی کانفرنسیں کر رہے تھے۔ وہ لوگ جو قوم کے تحفظ کے لیے تجویزیں اور بیانات شائع کر رہے تھے۔ وہ لوگ جو مظلوموں کی حمایت کے نام پر ٹیلی فون اور ہوائی جہاز کی تیزی کے ساتھ سرگرم تھے، سب کو اس نے آواز دی۔ مگر کوئی نہ تھا جو اس کی آواز کی طرف توجہ دے۔ شاید اس لیے کہ اس کا ساتھ دینا اپنے اندر کوئی اخباری اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے دوڑنا ان کی شان قیادت میں اضافہ کا باعث نہیں ہوتا تھا۔ اس کے معاملے کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنے میں ان کی انا کے لیے تسکین کا کوئی سامان نہ تھا۔

"میرے مالک! میرے معاملہ میں لوگ آپ سے نہ ڈرے" اس کی زبان سے نکلا اور آنسوؤں کے قطرے بے بسی کی تصویر بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ اس نے محسوس کیا کہ بھری ہوئی دنیا میں وہ اکیلا ہے۔ عجز کے آنسوؤں کے سوا اس کا کوئی شریک اور ساتھی نہیں۔ مگر عین اس وقت فطرت کی ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں سنائی دی: میرے بندے! تیرے آنسوؤں کے یہ قطرے میرے نزدیک تمام بموں سے زیادہ بھاری ہیں۔ اگر میں ایک آنے والے دن کے لیے زمین و آسمان کو تھامے ہوئے نہ ہوتا تو یقیناً آج زمین و آسمان ان کی تاب نہ لاکر پھٹ چکے ہوتے۔ مگر میرے بندے! وہ دن دور نہیں جب جھوٹ اور سچ کو الگ کیا جائے۔ اس دن کتنے وہ الفاظ بے معنی ثابت ہوں گے جو آج بامعنی دکھائی دیتے ہیں۔ اس دن کتنے وہ لوگ ظلم اور بے انصافی کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے جو آج امن اور انسانیت کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔

ایک کہاوت

جاپان کی ایک کہاوت ہے جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے ـــــ ایک خرگوش کا پیچھا کرو، اور تم اس کو پکڑ لوگے (Chase one rabbit, and you will get it)

اگر آپ بیک وقت دو خرگوش کو پکڑنا چاہیں تو کیا ہوگا۔ ایک خرگوش پورب کی طرف بھاگ رہا ہوگا اور دوسرا خرگوش پچھم کی طرف۔ آپ کبھی ایک کو پکڑنے کے لیے پورب کی طرف دوڑیں گے اور کبھی دوسرے کو پکڑنے کے لیے پچھم کی طرف۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں بھاگ کر دور چلے جائیں گے اور آپ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ پکڑ سکیں گے۔ اس کے برعکس جب آپ صرف ایک کی طرف دوڑیں تو آپ کی دوڑنے کی پوری طاقت صرف ایک کی طرف استعمال ہوگی، اور پھر آپ اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ معاملہ صرف "خرگوش" کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو بظاہر کئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ہر ایک کو چاہنے لگتا ہے۔ مگر کئی کو پانے کی کوشش میں وہ ایک کو بھی کھو دیتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ اپنی ساری توجہ صرف ایک پر لگاتا تو یقیناً وہ اس کو حاصل کر لیتا۔

اس کی ایک مثال کشمیر کا مسئلہ ہے۔ انڈیا اور پاکستان کی تقسیم آبادی کی بنیاد پر ہوئی۔ اس اعتبار سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ کشمیر پاکستان کو نہ مل سکا۔ اس کی واحد ذمہ داری پاکستان کے لیڈروں پر جاتی ہے۔

۱۹۴۷ میں جب برصغیر ہند کی تقسیم ہوئی تو پاکستانی لیڈروں نے چاہا کہ وہ حیدر آباد پر بھی قبضہ کریں اور کشمیر پر بھی۔ حیدر آباد پر اس لیے کہ وہاں کا صدر ریاست مسلمان ہے، کشمیر پر اس لیے کہ وہاں کی زیادہ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

وہ حیدر آباد کے معاملہ میں صدر ریاست کی منطق کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور کشمیر کے معاملہ میں آبادی کی منطق کو۔ یہ گویا دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنا تھا، اور جو لوگ بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑیں، ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ ایک کو بھی نہ پکڑ سکیں۔

فساد انگیزی

ہندستان کی ایک بستی ہے۔ یہاں ۸۰ فی صد ہندو ہیں ، اور ۲۰ فی صد کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ کچھ پرجوش مسلمانوں کے اندر اپنے مذہب کی برتری کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ اس جذبہ کا اظہار وہ علمی ، صحافتی ، سیاسی ، معاشی اور سماجی میدانوں میں کر سکیں۔ انھوں نے کالک کی روشنائی بنائی اور لکڑی کا قلم، اور بستی کی کچھ دیواروں پر بھدے حرفوں میں لکھ دیا :

مورتی پوجا پاپ ہے

اب ہندوؤں میں ردعمل پیدا ہوا۔ انھوں نے عمدہ ٹائپ میں چھپوا کر بڑے بڑے پوسٹر تیار کیے اور ساری بستی کی تمام دیواروں پر اسے چسپاں کر دیا۔ اس دوسرے پوسٹر میں لکھا ہوا تھا :

قبر پوجا مہاپاپ ہے

اس کے بعد دونوں فرقوں میں تناؤ بڑھا۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان لین دین کے ایک معاملہ میں جھگڑا ہوا۔ عام حالت میں وہ صرف دو آدمیوں کا جھگڑا بن کر رہ جاتا۔ مگر دو طرفہ کشیدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو فرقوں کا جھگڑا بن گیا۔ بستی میں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس کا نقصان یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

جن پرجوش مسلمانوں نے "مورتی پوجا پاپ ہے" کا جملہ دیواروں پر لکھا تھا، وہ اپنے گمان کے مطابق ، " دعوت " کا کام کر رہے تھے ، مگر باعتبار حقیقت انھوں نے صرف عداوت کا کام کیا۔ وہ مُصلح نہیں بلکہ مُفسد تھے۔ کیوں کہ دعوت کا پیغام دیواروں پر لکھا نہیں جاتا۔ وہ دلوں پر لکھا جاتا ہے۔ وہ فخر کا اظہار نہیں بلکہ تواضع کا اظہار ہے۔ وہ نعروں کے ذریعہ نہیں بلکہ دعاؤں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس کی تحریر روشنائی سے نہیں بلکہ آنسوؤں سے لکھی جاتی ہے۔ دعوت کا عمل نفرت کی زمین پر نہیں بلکہ محبت کی زمین پر انجام دیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا اصل مذہب قومی فخر ہے۔ اپنے قومی فخر کے مذہب کو وہ اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے قومی ہنگاموں کو اسلامی دعوت اور اسلامی جہاد کا نام دیدیتے ہیں۔ اس طرح کا ہر فعل صرف سرکشی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں دینی کام نہیں۔

بے جا شکایت

ایک مسلمان اخبار نویس نے کہا کہ ہندو لوگوں میں اتنا زیادہ تعصب ہے کہ وہ کبھی مسلمانوں کا اخبار نہیں پڑھتے۔ پروفیشنل ضرورت کے تحت کوئی پڑھ لے تو پڑھ لے، مگر عام ہندو مسلمانوں کا اخبار پڑھنا پسند نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ بطور واقعہ یہ بات صحیح ہے کہ ہندو لوگ مسلمانوں کا اخبار نہیں پڑھتے۔ مگر اس کی وجہ تعصب نہیں، اس کی وجہ خود مسلمانوں کے اخبارات کا ایک نقص ہے جس نے انھیں ہندوؤں کی نظر میں ایسا بنا دیا ہے جس میں ان کے لیے کوئی کشش نہ ہو۔

وہ نقص یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات، تقریباً بلا استثناء، ایک قسم کا احتجاج نامہ ہوتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی قومی شکایتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی چیزوں کو مسلمان تو شوق سے پڑھ سکتے ہیں، کیوں کہ جس کو خارش ہو، اس کو خارش کا کھجانا بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر دوسرے فرقہ کے لوگوں کو وہ کیوں اچھے لگیں گے۔

مسلمانوں کے اخبارات بنیادی طور پر فرقہ واریت کے نمائندہ ہیں نہ کہ آفاقیت کے۔ اور یہی وہ کمزوری ہے جس نے انھیں عمومی مقبولیت تک پہنچنے نہیں دیا۔ مثال کے طور پر اگر آپ اپنے اخبار میں یہ لکھیں کہ مسلمانوں کے ساتھ داخلہ اور سروس میں تعصب برتا جاتا ہے تو یہ بات دوسروں کی نظر میں ایک قسم کی فرقہ وارانہ چیخ پکار ہوگی۔ وہ ان کو اپنے آپ سے غیر متعلق چیز نظر آئے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ یہ بتائیں کہ دنیا میں ترقی کا راز محنت ہے تو یہ بات لوگوں کو ایک آفاقی حقیقت معلوم ہوگی۔ وہ اس کو سب کی چیز سمجھیں گے نہ کہ ایک فرقہ کی چیز۔ وہ اس کو خود اپنے لیے بھی اتنا ہی متعلق سمجھیں گے جتنا کہ دوسروں کے لیے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صحافت کو آفاقی صحافت بنائیں۔ وہ اس کو انسانی قدروں کا حامل بنائیں۔ اس کے بعد انھیں کسی سے مذکورہ قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی طرف توجہ دیں تو اپنے آپ کو دوسروں کے لیے مفید ثابت کیجیے۔ اس کے بغیر نہ کوئی مسلمان آپ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی غیر مسلمان۔

بیانِ حقیقت

ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی بات کو دلیل سے ثابت کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو سادہ طور پر بلا دلیل بیان کریں۔ انگریزی کا ایک مثل ہے کہ ایک واضح بیان مضبوط ترین استدلال ہے:

A clear statement is an argument in itself.

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بہت سی حدیثوں میں یہی دوسرا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اتنی موثر ہیں کہ انھوں نے کروروں لوگوں کے اندر انقلاب پیدا کر دیا۔

اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک واضح بیان سننے والے کے لیے بذاتِ خود دلیل بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ایک بیان کے ساتھ فطرت خود اضافہ کر کے اس کو مکمل کر لیتی ہے۔ دلیل کی کمی انسان کی فطرت خود پورا کر لیتی ہے۔

تمام حقیقتیں انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ وہ انسان کے لاشعور میں پیدائشی طور پر رکھ دی گئی ہیں۔ آدمی جب کسی حقیقت کو مانتا ہے تو وہ اس کو اس لیے مانتا ہے کہ وہ اس کی پیدائشی معرفت کے ساتھ مطابقت کر رہی ہے۔ ایک بیان جب سننے والے کی اپنی فطرت کے ساتھ مطابقت کر رہا ہو تو اُس کے بعد اِس کی حاجت نہیں رہتی کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے دلیل و برہان پیش کی جائے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو پیاس لگی ہوئی ہو۔ اس کو پانی کا ایک گلاس پیش کیا جائے تو اس کی ضرورت نہیں کہ پانی کی اہمیت پر اس کے سامنے تقریر کی جائے یا علمی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جائے کہ پانی انسان کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ آدمی کے اندر پانی کا احساس اس کو اس سے مستغنی کر دیتا ہے کہ وہ پانی کی اہمیت سمجھنے کے لیے دلیل کا طالب ہو۔

اسی طرح دینِ فطرت کا مجرد بیان بھی پوری طرح موثر ہو سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع بیانِ حقیقت ہو۔ اس میں کسی غیر فطری چیز کی آمیزش نہ کی گئی ہو۔ وہ اصل واقعہ سے اتنا زیادہ مطابقت رکھتا ہو کہ وہ معرفتِ فطری کا بے لاگ اظہار بن جائے۔ وہ اپنے صحتِ بیان کی بنا پر پورے معنوں میں فطرتِ انسانی کا مثنیٰ بن گیا ہو۔

بے خبری

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے اقلیتی مسلمانوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دنیا میں ۳۰۰ ملین ایسے مسلمان ہیں جو ایسے ملکوں میں رہتے ہیں جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور اس بنا پر وہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہے، یہ مسلمان سخت بے یقینی کی حالت میں ہیں۔ وہ ابھی تک اپنی سمت عمل طے نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حالت قوت (Position of strength) کے لیے تو ان مسلمانوں کے پاس ماڈل موجود ہے۔ مگر حالت فروتنی (Position of modesty) کے لیے ان کے پاس کوئی ماڈل موجود نہیں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس پر ازسر نو ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان مسلمانوں کو ان کے حالات کے اعتبار سے رہنمائی دی جا سکے۔

بطور واقعہ یہ بات درست نہیں کہ اسلام کے پاس " حالت قوت " کا ماڈل ہے، اس کے پاس " حالت فروتنی " کا ماڈل نہیں۔ اسلام کی تاریخ کا مکی دور مکمل طور پر اسی دوسرے ماڈل سے تعلق رکھتا ہے، جس کا زیادہ صحیح نام دور دعوت ہے۔

موجودہ زمانہ کے مصلحین نے مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے جو تدبیر استعمال کی، وہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کو ان کی " شاندار تاریخ " یاد دلائی۔ شاعر اور خطیب اور انشا پرداز قسم کے مصلحین نے یہ بات اتنی زیادہ بار کہی کہ اب وہی مسلمانوں کا شاکلہ (مزاج) بن گیا۔ چنانچہ موجودہ مسلمان ماڈل کے نام سے صرف اسلام کے دور اقتدار کو جانتے ہیں۔ وہ اسلام کے دور دعوت کو نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہم ساری دنیا میں یہ منظر دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان یا تو پست حوصلگی میں پڑے ہوئے ہیں، یا سیاست کی چٹان سے سر ٹکرا کر بے فائدہ طور پر اپنے کو ہلاک کر رہے ہیں۔ مسلمان اگر دعوت کے ماڈل کو جان لیں تو ان کا المیہ اچانک طربیہ میں بدل جائے۔

مزید یہ کہ " قوت " اور " فروتنی " کا تقابل بجائے خود غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے مطابق، مسلمانوں کی ایک ہی مستقل حالت ہے۔ اور وہ حالتِ دعوت ہے۔ ذاتی نوعیت کی شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد، مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ اول و آخر دعوت ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں وہ اصل مقصد کے اعتبار سے اضافی ہیں نہ کہ حقیقی

اجتماعی بصیرت

دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ حکمت ہے۔ حکمت جن بھیدوں کو بتاتی ہے ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ کیا چیز مسئلہ ہے اور کیا چیز مسئلہ نہیں۔ آپ کس چیز کو لیں اور کس چیز کو چھوڑ دیں۔ کہاں بولیں اور کہاں چپ رہیں۔ کس معاملہ میں دخل دیں اور کس معاملہ سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔

کتا اگر آپ پر حملہ کر دے تو آپ اس سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر کتا دور کھڑا ہوا بھونک رہا ہو تو آپ اس کو نظر انداز کر کے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ فرق زندگی کا ایک حکیمانہ اصول ہے اور ہر سمجھ دار آدمی ہمیشہ اس اصول پر عمل کرتا ہے۔

اس دنیا میں کچھ باتیں قابل لحاظ ہوتی ہیں۔ اور کچھ باتیں قابل اعراض۔ دانش مند وہ ہے جو دونوں باتوں کے فرق کو جانے۔ وہ صرف انھیں باتوں کو اہمیت دے جو فی الواقع اہمیت کے قابل ہیں۔ اور بقیہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سفر حیات جاری رکھے۔

جو لوگ ایسا کریں وہی اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ چیزوں کا فرق جانے بغیر ہر بات پر لوگوں سے الجھ جائیں، ان کے لئے صرف یہی مقدر رہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو بے نتیجہ کاموں میں ضائع کرتے رہیں اور آخر کار ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں۔

نادان آدمی صرف حال کو جانتا ہے، دانش مند آدمی حال کے ساتھ مستقبل کو بھی۔ نادان آدمی صرف اپنی خواہشوں سے باخبر ہوتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنی ذات سے باہر قوانین فطرت سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ نادان آدمی صرف اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنے آگے، اپنے پیچھے، اپنے دائیں، اپنے بائیں ہر طرف نظر رکھتا ہے۔ نادان آدمی کا اقدام عاجلانہ اقدام ہوتا ہے اور دانش مند آدمی کا اقدام منصوبہ بند اقدام۔

ایک سنت

مکی دور کا واقعہ ہے، ابو لہب کی بیوی ام جمیل ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

تلاش میں نکلی۔ اس وقت آپ بیت اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوبکر صدیق رضؓ بھی آپ کے پاس موجود تھے۔ ام جمیل شاعرہ تھی۔ اس نے آپ کی ہجو میں یہ اشعار کہے کہ ہم نے ایک قابل مذمت شخص کی نافرمانی کی۔ اس کی بات ماننے سے انکار کیا اور اس کے دین سے بیزاری ظاہر کی:

مذمّماً عصینا وامرہ ابینا و دینہ قلینا

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہؐ کا نام محمد کے بجائے مذمّم رکھ دیا تھا۔ وہ یہی نام لے کر آپ کے خلاف سب وشتم کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو سنتے تو فرماتے:

الا تعجبون لما صرف اللہ عنی من اذی قریش۔ یسبون و یھجون مذمّماً و انا محمد (سیرۃ ابن ہشام ۱/۳۷۹)۔

کیا تم لوگوں کو اس بات پر تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی اذیت مجھ سے پھیر دی۔ وہ ایک مذمم کو گالی دیتے ہیں اور اس کی ہجو کرتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔

یعنی جب وہ "مذمّم" کہہ کر سب وشتم کرتے ہیں تو ان کا سب وشتم اس پر واقع ہوگا جو مذمّم ہو۔ میں مذمم نہیں ہوں۔ میرا نام تو محمد ہے۔ پھر مجھے ان کی گالیوں پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ گویا کسی کے برے لفظ پر اس کو غصہ ہونا چاہئے جس پر وہ پڑ رہا ہو۔ جس کے اوپر بطور واقعہ اس کے برے الفاظ پڑ نہ رہے ہوں، اس کو اسے قابل لحاظ بھی نہیں سمجھنا چاہئے۔

یہ اصول صرف حال کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ مستقبل کے لئے بھی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک مخالفانہ ارادہ کا اظہار کرے تو ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا اس کا بُرا ارادہ مستقبل میں واقعہ بننے والا ہے یا نہیں۔ اگر حالات کا مطالعہ بتائے کہ اس کا بُرا ارادہ عملاً وقوع میں آنے والا نہیں ہے تو ایسے ناممکن الوقوع منصوبہ کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسی باتوں میں الجھنا دانش مند انسان کا طریقہ نہیں۔

حقیقت غالب آتی ہے

ٹائمس آف انڈیا، دوسرے تمام اخباروں کی طرح، ہر روز نئی نئی خبریں جلی حرفوں میں چھاپتا ہے۔ ان خبروں کو ہر پڑھنے والا روزانہ پڑھتا ہے۔ مگر ایک خبر جو ٹائمس آف انڈیا میں ہر

روز بلاناغہ چھپتی ہے ، اس کو شاید بہت کم قارئین نے پڑھا ہوگا۔ اور ایسا تو ایک بھی قاری نہیں ہوگا جو ہر روز اس خبر کو پڑھے۔ یہ ہے اس کے صفحہ اول کی پیشانی پر اخبار کے مونو گرام کے ساتھ باریک حرفوں میں لکھا ہوا یہ فقرہ کہ سچائی غالب رہتی ہے (Let truth prevail)

تین لفظ کے اس جملہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلاشبہ دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اگر صرف اس ایک حقیقت کو لوگ جانیں اور اس کو اچھی طرح پکڑ لیں تو دنیا کے بیشتر جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

اطالوی فلکیات داں گلیلیو (Galileo) نے کوپرنیکس کے نظریہ کی حمایت کی اور کہا کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ یہ رومن چرچ کے عقیدہ کے خلاف تھا۔ ۱۶۱۶ میں گلیلیو کو پوپ کی عدالت میں بلایا گیا۔ اور اس کو یہ کہنے کے لئے مجبور کیا گیا کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ سزا سے ڈر کر گلیلیو نے یہ جملہ اپنی زبان سے دہرا دیا۔ مگر جب وہ عدالت سے باہر نکلا تو اس نے آہستگی سے کہا: زمین تو اب بھی سورج ہی کے گرد گھوم رہی ہے۔

فلکیاتی قوانین کوپرنیکس کے نظریہ کے حق میں تھے۔ چنانچہ مسیحی عدالت میں گلیلیو کے مجبورانہ بیان کے بعد بھی زمین سورج کے گرد گھومتی رہی۔ چرچ اگر یہ جانتا کہ لوگوں سے لفظی تردید کرانے کے باوجود عملی طور پر یہی ہوگا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی رہے گی، یہاں تک کہ ساری دنیا اس کو مسلمہ حقیقت کے طور پر مان لے تو چرچ کبھی مذکورہ قسم کی مضحکہ خیز حرکت نہ کرتا۔

یہی سچائی کا باقی رہنا ہے۔ موجودہ دنیا خود اپنے محکم قوانین پر چل رہی ہے۔ وہ کسی انسان کے الفاظ کی پابند نہیں۔ یہاں وہی ہوگا جو ہونا ہے، وہ نہیں ہوگا جو کسی نے کہہ دیا ہو۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ آپ کسی کے بولے ہوئے الفاظ کو نہ دیکھیں۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ حقیقتِ واقعہ کیا ہے۔ کیوں کہ جو بات حقیقت واقعہ کے مطابق نہ ہو وہ فضا میں تحلیل ہو جائے گی اور آخر کار جو چیز باقی رہے گی اور غالب آئے گی وہ حقیقت ہوگی نہ کہ کسی ایک یا دوسرے شخص کے بولے ہوئے الفاظ۔

یہ سوچ درست نہیں

میں نے حال ہی میں ایک کتاب پڑھی۔ اس کے مصنف مسٹر چترویدی بدری ناتھ (IAS)

ہیں۔ اور وہ ساڑھے تین سو صفحہ پر مشتمل ہے۔ پورا حوالہ یہ ہے:

Chaturvedi Badrinath,
Dharama, India and the World Order, 1993

اس کتاب کے ایک حصہ میں انڈیا کی تقسیم پر کلام کیا گیا ہے۔ مصنف نے ملک کی تقسیم کا ذمہ دار آر ایس ایس کو قرار دیا ہے۔ آر ایس ایس کے سابق سرسنچالک کی ایک کتاب ۱۹۳۹ میں انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپی تھی۔ یہ کتاب نیشن ہڈ کے بارہ میں تھی اور اس کا نام یہ تھا:

We or Our Nationhood Defined

۵۵ سال پہلے چھپنے والی اس کتاب میں انھوں نے نہ صرف انڈین نیشنلزم کو ہندو نیشنلزم کے ہم معنی قرار دیا تھا۔ بلکہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ مسلمان یا عیسائی کبھی ہندستان کا سچا نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندستان کا سچا نیشنلسٹ وہ ہے جو ہندستان کی سرزمین کو مقدس مانے۔ چونکہ مسلمان اور عیسائی ہندستان کو مقدس نہیں مانتے، اس لئے وہ سچے نیشنلسٹ بھی نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہندو ہی نیشنلسٹ ہیں کیوں کہ صرف ہندو ہی انڈیا کو تقدس کی نظر سے دیکھتے ہیں:

Only the Hindus, We, are nationalists. For the Hindus alone look upon India as a holy land, motherland, fatherland, every particle of whose dust is sacred to them. (p. 300)

مصنف لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم نیشنلزم ہندو نیشنلزم کی جوابی پیداوار تھا۔ پاکستان کے نظریہ کا بیج ہندو دانشوروں نے بویا نہ کہ مسلمانوں نے:

The truth is that Muslim nationalism was a product, emotional and political, of Hindu nationalism with its insistence that India's swa, or 'one's own,' was Hindu. The seeds of the idea of Pakistan were sown, without knowing it, by the Hindu intellectuals and not by the Muslims. (p. 301)

یہ صرف ایک مصنف کی بات نہیں۔ متعدد دانشوروں نے یہی بات ایک یا دوسرے انداز سے کہی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سیروائی، ڈاکٹر رفیق زکریا، وغیرہ۔ اس سلسلہ میں غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب آزادیٔ ہند (India wins Freedom)

میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور تقسیم ملک کی ذمہ داری کانگرس (بالفاظ دیگر ہندو لیڈر شپ) پر ڈالی ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ہندستان میں ۱۹۳۷ میں ریاستوں کے الکشن ہوئے۔ اس سے پہلے کانگرس اور مسلم لیگ میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ الکشن کے بعد دونوں پارٹیاں مل کر کولیشن گورنمنٹ بنائیں گی۔ مگر جب الکشن ہوا تو چھ ریاستوں میں خلاف اندازہ کانگرس کو مطلق اکثریت حاصل ہو گئی۔ اس وقت کے صدر کانگرس جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ماقبل الکشن معاہدہ کے پابند نہیں ہیں۔ اس پر کانگرس اور مسلم لیگ میں نزاع پیدا ہو گئی۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ یوپی میں ہوا جہاں کانگرس نے معاہدہ کے خلاف مسلم لیگی مسلمان کو کیبنٹ میں نہیں لیا بلکہ کانگرسی مسلمان کو وزیر بنا دیا۔

یہ بات بظاہر اہم دکھائی دیتی ہے۔ مگر باعتبار حقیقت وہ ناقابل لحاظ ہے۔ کیوں کہ سیاست ہمیشہ عملی حالات کی پابند ہوتی ہے۔ سیاست کو کبھی مطلق معیار سے ناپا نہیں جا سکتا۔ حتی کہ افراد سیاست کی نیت اگر انتہائی صالح ہو تب بھی سیاست میں نظری معیار کو چلانا ممکن نہیں۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جب خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا تو انصار مدینہ نے کہا کہ ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا۔ (منا امیر و منکم امیر) اس کے جواب میں مہاجرین مکہ نے کہا کہ دو امیر کا طریقہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم امیر ہوں اور تم وزیر بنو۔ (نحن الامراء و انتم الوزراء) مگر اس پر عمل نہ ہو سکا اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق نے اپنی آخر عمر میں کہا کہ ہم نے انصار سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کو خلافت میں وزیر بنائیں گے مگر ہم انھیں وزیر نہ بنا سکے۔

سیاست میں اس قسم کے نشیب و فراز کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔ اس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ حتی کہ اگر ملک کو تقسیم کر کے اس کا ایک حصہ ایک فرقہ کو اور دوسرا حصہ دوسرے فرقہ کو دے دیا جائے تب بھی اس قسم کے خلاف معیار واقعات بہر حال پیش آتے رہیں گے۔

ایسی حالت میں صرف ایک ہی ممکن حل ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو اقدام کا اشو نہ بنایا جائے، بلکہ انھیں اعراض کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔

مسلم لیگی لیڈر اگر فہم وبصیرت کے حامل ہوتے تو وہ کہتے کہ چلو کوئی حرج نہیں۔ آج اگر کانگرسی مسلمان وزیر بنا ہے تو کل انشاء اللہ ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ مسلم لیگی مسلمان وزیر بنے۔ ہماری نظر مستقبل پر ہونی چاہئے نہ کہ صرف حال پر۔ اگر مسلم لیڈر شپ اس دوراندیشی کا ثبوت دیتی تو آج یقیناً تاریخ دوسری ہوتی۔

اگر اس معاملہ کے سارے پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری مذکورہ قسم کے ہندوؤں پر نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری تمام تر خود مسلمانوں کی نااہل لیڈر شپ پر ہے۔ کیوں کہ انھوں نے یہ غلطی کی کہ جو واقعہ صرف اس قابل تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے، اس کو انھوں نے غیر ضروری طور پر اہمیت دی۔ حتی کہ اس کے اوپر اپنی ملی پالیسی کی بنیاد قائم کر دی۔

ایک تقابل

۱۹۴۷ سے پہلے غیر منقسم ہندستان میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اسلام کے نام پر ایک تحریک شروع کی۔ ملک کے کچھ مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام کا مقصد خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اپنے عقیدہ کی رو سے مسلمان کا تعلق ہر غیر الٰہی نظام سے بغاوت کا ہے نہ کہ مصالحت کا۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ خدا کی زمین پر صرف خدا کا قانون نافذ کیا جائے۔ غیر مسلمین خدا کی زمین پر اہل اسلام کے ماتحت ہو کر رہ سکتے ہیں مگر ان کو یہ حق نہیں کہ وہ خدا کی زمین پر اپنا قانون چلائیں یا اپنا اقتدار قائم کریں۔

اب اگر ایک انتہا پسند ہندو یہ کہے کہ تقسیم کا اصل سبب یہی اسلامی تحریک ہے۔ کیوں کہ جب غیر منقسم ہندستان میں اس قسم کی تحریک اسلام کے نام پر اٹھی اور مسلمانوں نے اس کا استقبال کیا تو ہندوؤں نے سوچا کہ ایسی حالت میں آزادی ہمارے لئے بے معنی ثابت ہوگی۔ آج ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ آزادی کے بعد مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے یہ کوشش کرینگے کہ وہ پورے ملک میں حکومت الٰہیہ قائم کریں جس میں ان کی حیثیت حاکم کی ہو اور ہماری حیثیت

صرف ذمی یا محکوم کی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ملک کو تقسیم کرکے ایک حصہ مسلمان کو دیدیا جائے تاکہ بقیہ حصے پر ہم اپنی پسند کی حکومت قائم کرسکیں۔

مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی عالم یا مسلم دانشور ہندو کی اس دلیل کو نہیں مانے گا۔ وہ اس کو رد کرنے کے لئے کہے گا کہ یہ صرف چند سرپھرے مسلمانوں کا تخیل تھا نہ کہ ہندستان کی پوری امت مسلمہ کا نظریہ۔ یہ جواب یقیناً درست ہے۔ اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس پر میرا اضافہ صرف یہ ہے کہ یہی جواب خود ہندوؤں کی طرف سے بھی دیا جاسکتا ہے اور دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہندو نیشنلزم کی مذکورہ بات چند انتہا پسند ہندوؤں کا تخیل تھا۔ ہندستان کی ہندو کمیونٹی نہ پہلے اس سے متفق تھی اور نہ آج اس سے اتفاق کرتی ہے۔

گویا کہ اس معاملہ میں ہندو کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خود ساختہ نظریہ سازی سے اعراض کرنا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ گرو گوالکر کی خود ساختہ نظریہ سازی کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیں۔ اس قسم کی باتیں ہمیشہ قابل اعراض ہوتی ہیں نہ کہ قابل لحاظ۔

مسلم خیر خواہی

جو لوگ تقسیم ہند کا ذمہ دار ہندوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایسا کرکے صرف اپنی نادانی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بطور خود وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ مسلمانوں کے سر سے تقسیم کی ذمہ داری کو ہٹا رہے ہیں۔ مگر اس طرح کسی کے سر سے کوئی ذمہ داری کبھی نہیں ہٹتی۔ مسلمان تقسیم کا مطالبہ کرکے تاریخی طور پر اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکے ہیں اور پاکستان سارے عالم کو گواہ بنا کر اس کو اپنے مفاخر میں درج کرچکا ہے کہ ہندو تقسیم پر راضی نہیں تھا۔ ہمارے قائد اعظم نے اپنی غیر معمولی سیاست کے ذریعہ اس کو ماننے پر مجبور کردیا۔ ایسی حالت میں کوئی دانشور ایک نکتہ نکال کر اس قائم شدہ تاریخی واقعہ کو بدل نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تقسیم کا ذمہ دار ہندوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایسا کرکے مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں کررہے ہیں۔ مسلمانوں کی سچی خیر خواہی یہ ہے کہ انھیں ان کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ وہ آئندہ اس کو دہرانے سے بچ جائیں، جیسا کہ عرض

کیا گیا، اس دنیا کا کوئی سماج مذکورہ قسم کی باتوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسی حالت میں جو لوگ ان باتوں کو اہمیت دیں وہ ہمیشہ ان میں الجھ کر اپنا نقصان کرتے رہیں گے۔ چنانچہ تقسیم کے صرف بیس سال بعد مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اسی قسم کی باتوں پر لڑ گئے۔ یہاں تک کہ دوبارہ پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس قسم کی انتہا پسندانہ نظریہ سازی کا واحد حل یہ ہے کہ ان کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جائے۔

تقسیم کا فیصلہ

۲۴ مارچ ۱۹۴۰ کو لاہور میں مسلم لیگ کے سیشن میں مسٹر محمد علی جناح نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے مذکورہ ذہن کی بنا پر ان کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو علیحدہ ہوم لینڈ دیا جائے۔ ردعمل کا یہ ذہن مسلمانوں میں بڑھا یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا۔

اوپر کی باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو مسٹر جناح کا یہ بیان صرف نادانی کا ردعمل معلوم ہوگا۔ اس کو ہرگز رہنمائی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ مسٹر جناح صرف ایک قانون داں تھے۔ اگر وہ تاریخ کو اور حقائق حیات کو جانتے تو مسلمانوں سے کہتے کہ تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ملک کے مستقبل کی تشکیل جو چیز کرے گی وہ تاریخی حقیقتیں ہیں نہ کہ گرو گولوالکر یا کسی اور انتہا پسند لیڈر کے الفاظ۔ اس لئے تم اس قسم کے الفاظ کو نظر انداز کر دو اور عظیم ہندستان میں اپنے لئے ایک عظیم مستقبل کی تعمیر کرو۔

اب غور کیجئے کہ عملاً ہندستان میں کیا پیش آیا۔ شری گرو گولوالکر نے ۱۹۳۹ میں یہ الفاظ کہے تھے۔ مگر نصف صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود یہ الفاظ ابھی تک واقعہ نہ بن سکے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ۱۹۴۷ میں آزادی ملنے کے بعد خود ہندو لیڈروں نے ہندو عوام کی حمایت سے ملک میں طاقت ور سیکولر گورنمنٹ بنائی۔ یہ سیکولر نظام آج تک یہاں قائم ہے اور کوئی بھی اس کو بدلنے پر قادر نہ ہو سکا۔

آزادی کے بعد ثمانینات (eighties) میں دوبارہ کچھ انتہا پسند ہندو ابھرے۔ انھوں نے ہندوتو کا نعرہ لگایا اور کہا کہ ہندستانی نیشنلزم کلچرل نیشنلزم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

مسلم رہنماؤں اور دانشوروں نے دوبارہ اس کے مقابلہ میں سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کو ہندو کلچر میں رنگنے کی ایک سازش ہے۔ مگر عملاً کیا پیش آیا۔ دوبارہ یہی ہوا کہ ہندتو کے لیڈروں کے بولے ہوئے الفاظ واقعہ نہ بن سکے۔ انھوں نے اپنے کو کامیاب بنانے کے لئے مندر۔مسجد کے نام پر انتہائی جذباتی تحریک چلائی۔ اس کے لئے انھوں نے اپنی ساری طاقت خرچ کر ڈالی مگر ۱۹۹۳ کے الکشن میں دنیا نے دیکھا کہ کلچرل نیشنلزم کے علمبردار سارے ملک میں زبردست سیاسی ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں۔ اپنے نظریہ کے حق میں انھیں خود ہندو ووٹروں کی تائید بھی حاصل نہ ہو سکی۔

ہندو نیشنلزم یا کلچرل نیشنلزم کا نظریہ کیوں انڈیا میں ناکام ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندستانی نظریہ عالمی قومی نظریہ سے ٹکرا رہا تھا۔ اور اس معاملہ میں کسی ملک کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ نیشن ہڈ کے لئے انٹرنیشنل معیار کے سوا کوئی اور معیار اپنے لئے مقرر کرے۔ اگر کوئی ملک اس معاملہ میں علیحدہ معیار مقرر کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا معیار عملاً چلنے والا نہیں۔

تقدیس ملک کا تصور کچھ افراد کا مذہبی عقیدہ ہو سکتا ہے مگر نیشن ہڈ کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عالمی معیار کے مطابق، نیشن ہڈ کی بنیاد اشتراک وطن پر ہے نہ کہ کسی تقدیسی عقیدہ پر۔ اور انڈیا میں بھی یقینی طور پر ہمیں اس عالمی معیار کو ماننا ہوگا۔ اگر نیشن ھڈ کے مذکورہ تقدیسی معیار کو صحیح قرار دیا جائے تو ساری دنیا کے لوگوں کے لئے فرض کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے دیش کے غدار ہیں۔ کیوں کہ کسی بھی ملک میں تقدیس وطن کا تصور موجود نہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ملکوں میں اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی (patriotism) موجود ہے اور اسی لئے وہ ممالک ترقی کر رہے ہیں۔

یہی معاملہ کلچرل نیشنلزم کا ہے جو مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ عالمی ذہن سے ٹکرا رہا ہے۔ دنیا میں اس معاملہ میں غالب قومی نظریہ ملٹی کلچر نیشنلزم کا ہے۔ اور ہندستان میں کچھ لوگ اس کے خلاف یونی کلچر نیشنلزم کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایسی خلاف زمانہ کوشش کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔

امریکہ اور کناڈا میں دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ تحریک اٹھی جس کو یونی کلچرلزم کہا جاتا ہے۔ مگر ان ملکوں کے دانشوروں نے دیکھا کہ وہ قابل عمل نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو چھوڑ کر ملٹی کلچرلزم کے اصول کو اختیار کر لیا۔ پھر جو چیز دنیا کے دوسرے ملکوں میں کامیاب نہیں ہوئی وہ انڈیا میں کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلچر ہمیشہ تاریخی عوامل سے بنتا ہے۔ وہ اوپر سے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ انڈیا میں اسکول اور کالج کے طلبہ جب ملتے ہیں تو نمستے یا نمسکار کہنے کے بجائے وہ ایک دوسرے کو ہائے (Hi) کہتے ہیں۔ یہ گریٹنگ کا امریکی طریقہ ہے۔ اسی طرح انڈیا کے دستور میں ہندی کو قومی زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ مگر تمام سرکاری اور غیر سرکاری لوگ انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے کلچرل طریقے انڈیا میں تاریخی اسباب سے رائج ہوئے ہیں نہ کہ کسی نافذ کرنے والے نے ان کو نافذ کیا ہے۔ کلچر قوموں کے اختلاط سے اپنے آپ بنتا ہے، وہ کبھی مصنوعی طور پر نہیں بنایا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ زندگی کے معاملات کو جو چیز تشکیل دیتی ہے وہ تاریخ کی قوتیں ہیں نہ کہ کسی کے بولے یا لکھے ہوئے الفاظ۔ اگر ایسا ہو کہ لوگ الفاظ کے بجائے حقیقتوں پر دھیان دیں۔ الفاظ کے معانی کو وہ ڈکشنری میں نہ دیکھیں بلکہ تاریخ کے صفحات میں دیکھیں تو ہمارا سماج اس ذہنی تناؤ سے بچ جائے گا جو اکثر بے بنیاد باتوں پر پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے آخری بربادی تک پہنچ جاتا ہے۔

اس دنیا میں ہمیشہ سچائی غالب آتی ہے۔ یہی تاریخ کی اور عقل کی گواہی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے لئے امید کا راز چھپا ہوا ہے۔

مسئلہ کی جڑ

ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ وہ حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آدمی اگر حقیقت واقعہ کا اعتراف کرے تو اس کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے آغاز مل جاتا ہے۔ اور اگر وہ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کرے تو اس کو زندگی کی تعمیر کا آغاز ہی نہیں ملتا۔ اور جن لوگوں کو آغاز نہ ملے وہ اختتام تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔

ہندستان میں مسلمان کی حیثیت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ وہ یہاں اکثریت کے بعد (next to majority) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جو آدمی کسی سماج میں مسٹر نکسٹ کی حیثیت رکھتا ہو، اس کو فریق ثانی سے یک طرفہ طور پر ایڈجسٹمنٹ کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ ہمیشہ پریشانیوں کا شکار ہوتا رہے گا۔

ساری دنیا میں جہاں بھی کوئی مسلمان مسٹر نکسٹ کی حیثیت میں ہو، وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ مثلاً ہندستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان بڑی تعداد میں عرب ممالک، امریکہ اور یورپ میں رہتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی حیثیت یہی ہے۔ اور ہر جگہ وہ اپنی اس حیثیت کا اعتراف کرکے رہ رہے ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ نہ ان ملکوں میں رہ سکیں اور نہ ان کو وہاں ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔

"مسٹر نکسٹ" بننا ایک بندوبست کا مسئلہ ہے نہ کہ تفریق و امتیاز کا مسئلہ۔ مسجد میں روزانہ مسلمانوں کو اس بات کا سبق دیا جاتا ہے۔ مسجد کے اندر ایک سو نمازی ہوں تو صرف ایک آدمی آگے امام کی جگہ کھڑا ہوتا ہے۔ باقی ۹۹ آدمی پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ایسا ممکن ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر نماز باجماعت قائم ہو سکے۔

امام اور مقتدی کی یہ ترتیب کوئی تفریق و امتیاز کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بندوبست کا مسئلہ ہے۔ یہی طریقہ فطرت نے پوری زندگی کے لیے قائم کیا ہے۔

تواضع بذاتِ خود ایک عبادت ہے۔ تواضع کا فعل بظاہر انسان کے سامنے کیا جاتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ خدا کے آگے جھکنا ہے۔ وہ گویا خدا کے مقابلہ میں پیدا شدہ ربانی نفسیات کا انسانی معاملات میں اظہار ہے۔

دین کے نام پر بے دینی

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ سیکولرزم اور لادینیت کے نام پر گمراہی پھیلا رہے ہیں ۔ یہ بلاشبہہ مفسد لوگ ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ بڑے مفسد وہ لوگ ہیں جو قرآن کا نام لے کر گمراہی پھیلائیں۔ جو قرآن کی آیتوں کی خود ساختہ تفسیر کریں۔ اور پھر اپنی اس ذاتی تفسیر کی بنیاد پر تحریک چلاکر یہ اعلان کریں کہ وہ خالص قرآن کی بنیاد پر تحریک چلا رہے ہیں۔

کچھ انقلابی نظریہ سازوں نے موجودہ صدی کے نصف اول میں ایک اسلامی نظریہ بنایا۔ اس کا عنوان "حکومت الٰہیہ" تھا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی حکومت بقیہ کائنات میں اپنے آپ قائم ہے۔ مثلاً شمسی نظام کو خدا براہ راست اپنے حکم کے تحت چلا رہا ہے۔ مگر انسانی دنیا میں اس کی حکومت قائم نہیں۔ یہاں خدا نے اپنی حکومت قائم کرنے کا کام ان لوگوں کے سپرد کیا ہے جو اس پر ایمان لاکر اس کے مومن بن جائیں۔

اسی انقلابی نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جگہ جگہ جہاد کے نام پر فساد جاری کئے ہوئے ہے۔ اپنے دعوے کے مطابق، وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر نکل پڑا ہے تاکہ خدا سے پھرے ہوئے انسانوں سے لڑ کر انھیں زیر کرے اور پھر انسانی دنیا میں بھی خدا کا اقتدار قائم کر دے جس طرح وہ کائناتی دنیا میں قائم و نافذ ہے۔

یہ ایک بدترین گمراہی ہے ۔ یہ نام نہاد انقلابی نظریہ بلاشبہہ اسلام کی مفسدانہ تفسیر ہے۔ آج بہت سے غیر مسلمین اگر اسلام کو دہشت گردی کا مذہب کہتے ہیں تو اس غلط فہمی کے لئے اصل ذمہ دار یہی نظریہ ساز مسلمان ہیں۔ کیوں کہ مذکورہ نظریہ کے بعد اسلام کی جو تصویر بنتی ہے وہ بلاشبہہ یہی ہے۔

اس خود ساختہ نظریہ کی بنیاد اس واقعہ پر ہے کہ اسلام میں انفرادی احکام کے ساتھ سیاسی احکام بھی دئے گئے ہیں ۔ مگر یہ سراسر مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا تعلق امتحان اور آزمائش کے مسئلہ سے ہے نہ کہ حکومتِ الٰہیہ کے مسئلہ سے۔ موجودہ دنیا میں ہر انسان آزمائش کے مرحلہ میں ہے۔ یہ آزمائش باعتبار اختیار ہے ، یعنی جتنا اختیار اتنی ہی آزمائش ۔ مثلاً

ایک شخص کو صرف یہ اختیار ہے کہ وہ خود شراب پئے یا نہ پئے تو اس کی آزمائش صرف اس اعتبار سے ہوگی کہ وہ خود شراب پیتا ہے یا نہیں پیتا۔ دوسرے شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ شراب کی دکان کھولے یا نہ کھولے تو اس کی آزمائش اس کے اپنے دائرۂ عمل کے اعتبار سے ہوگی۔ تیسرے شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ شراب پینے والے کو سزا دے یا نہ دے تو اس کی آزمائش اس اعتبار سے ہوگی کہ وہ شرابی آدمی کو چھوڑ دیتا ہے یا اس کے اوپر خدا کی بتائی ہوئی سزا کو نافذ کرتا ہے۔

اسی طرح شریعت الٰہی کے تمام احکام انسان کی جانچ کے لئے ہیں اور وہ ہر انسان کے اپنے دائرہ اختیار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی حکم یا احکام کا کوئی مجموعہ اس نظریہ سے تعلق نہیں رکھتا کہ خدا کی حکومت زمین پر یا انسانی دنیا پر قائم نہیں ہے اور اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم خدا کے نائب بن کر خدا کے اقتدار کو اس حصۂ کائنات پر نافذ کریں۔

انسان کو موجودہ زمین پر اس لئے نہیں بسایا گیا ہے کہ وہ یہاں اقتدار خداوندی کی تکمیل کرے۔ انسان کو یہاں بسانے کا واحد مقصد امتحان ہے۔ انسان کو عارضی مدت کے لئے یہاں رکھ کر خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص اپنے اختیار کو جائز حدود کے اندر استعمال کرتا ہے اور کون اختیار پا کر سرکش بن جاتا ہے (خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا) اس اعتبار سے شخصی دائرہ میں حکم الٰہی کی تعمیل بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی حیثیت رکھتی ہے جو حکومتی دائرہ میں اپنے اختیار کو استعمال کرنے کی ہے یا ہو سکتی ہے۔

تحریف یا استدلال

اس نظریہ کے حق میں قرآن سے جو دلائل دئے جاتے ہیں، وہ تحریف کی حد تک غلط ہیں۔ ان میں سے اکثر دلائل کا تجزیہ "تعبیر کی غلطی" نامی کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم ان حضرات کی ایک اور دلیل کی وضاحت کریں گے۔

یہ دلیل قرآنی آیت وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۳) کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا کو بڑا کرو۔ یعنی خدا کی سیاسی اور حکومتی بڑائی کو زمین پر قائم کرو۔ اس نظریہ کے مطابق، اسلام صرف روزہ اور نماز کا نام نہیں ہے۔ اسلام یہ ہے کہ دنیا میں سیاسی انقلاب برپا کیا جائے۔ ساری دنیا میں خدائی قانون کو نافذ کیا جائے۔ خدا کی بڑائی

جو ساری کائنات میں قائم ہے، اس کو زمین پر قائم کرکے اس کی بڑائی کی تکمیل کی جائے۔

یہ حضرات وربک فکبر کا ترجمہ کرتے ہیں ـــــ اور اپنے رب کو بڑا کر۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ تکبیر کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا صرف اعلان یا اعتراف کر دیا جائے، زبان سے اللہ اکبر کہہ دیا جائے۔ بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کی سیاسی بڑائی کو زمین پر نافذ کیا جائے۔ اس کی کبریائی کی بنیاد پر مبنی حکومتی نظام کو بالفعل قائم کیا جائے۔ اپنی اس تشریح کی روشنی میں اور اپنے اس دعوے کے مطابق، یہ حضرات انقلابی تحریک چلا رہے ہیں جس کا مدعا یہ ہے کہ سیکولر حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹاکر اسلام پسند حکمرانوں کو اقتدار پر بٹھایا جائے۔ اور پھر یہ اسلام پسند حکمراں خدا کے نائب بن کر خدا کی بڑائی کو زمین پر قائم کریں۔

"تکبیر رب" کا یہ مفہوم نہ صرف علمی اعتبار سے بے بنیاد ہے بلکہ وہ لرزہ خیز حد تک ایک بیجا جسارت ہے۔ کیوں کہ اللہ کی بڑائی تمام دنیا پر اپنے آپ قائم ہے۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی شخص اللہ کی بڑائی کو اس کی طرف سے دنیا کے اوپر قائم اور نافذ کرے۔

بلاشبہ اسلام میں یہ بھی مطلوب ہے کہ حسب حالات سیاسی اور حکومتی معاملات میں شرعی قانون کو جاری کیا جائے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ انسانی امتحان کا مسئلہ ہے نہ کہ خدا کی بڑائی قائم کرنے کا مسئلہ۔ جس طرح انفرادی زندگی کے احکام ایک فرد کے لئے بطور آزمائش ہیں۔ اسی طرح شریعت کے اجتماعی احکام بھی ان لوگوں کے لئے آزمائش ہیں جو اجتماعی امور کا اختیار رکھتے ہوں۔ ان احکام کا اس خود ساختہ نظریہ سے کوئی تعلق نہیں کہ زمین پر خدا کی بڑائی قائم نہیں ہے اور اب ضرورت ہے کہ مسلمان یہاں خدا کی بڑائی قائم کرکے اس کے اقتدار کو مکمل کریں۔

جیسا کہ معلوم ہے، تکبیر یا اللہ اکبر کا کلمہ سب سے زیادہ نماز کے عمل میں دہرایا جاتا ہے۔ یہ عمل روزانہ پانچ اوقات میں مسجد کے اندر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسجد کے اندر خدا کا سیاسی اقتدار قائم نہ تھا، اور نمازیوں نے تکبیر (اللہ اکبر) کا عمل کرکے مسجد کے احاطہ میں خدا کی سیاسی بڑائی کا تخت بچھا دیا۔

مسجد کے ماحول میں اللہ اکبر کی تکرار ایک خالص شخصی عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بندہ جس کو اللہ نے فکر و عمل کی آزادی دی تھی، اس نے مسجد میں آکر خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار

کیا۔ اس نے اللہ اکبر کا کلمہ اپنی زبان سے ادا کر کے یہ اعتراف کیا کہ میں چھوٹا ہوں. بڑائی اور عظمت سب کی سب ایک ذوالجلال و الاکرام کو حاصل ہے

مسجد میں اللہ اکبر کی تکرار، اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک انفرادی اور نفسیاتی عمل ہے نہ کہ سیاسی اور حکومتی عمل۔ یہ ایک موجود عظمت کا اقرار کرنا ہے نہ کہ غیر موجود عظمت کو نافذ اور قائم کرنا۔

تکبیر رب کا حکم قرآن میں متعدد مقام پر آیا ہے۔ کہیں اسی خاص لفظ میں اور کہیں دوسرے الفاظ میں۔ اس سلسلہ میں قرآن کے چار مقامات یہ ہیں ــــــ البقرہ ۱۸۵، الحج ۳۷، الاسراء ۱۱۱، المدثر ۳۔

ان چاروں آیتوں میں تکبیر رب کا حکم آیا ہے۔ مگر تمام مفسرین نے بالاتفاق یہاں "اللہ اکبر" کہنا مراد لیا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی کبّرۃ یا تکبیر کا لفظ ہے، اس کا مطلب مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ "اللہ اکبر کہو" تاہم کہنے کا مطلب مجرد کلمۂ تکبیر کا تلفظ نہیں ہے بلکہ حقیقت تکبیر کا قلبی اعتراف ہے۔ زبان سے اللہ اکبر کہنا دراصل اس بات کا ظاہری اعلان ہے کہ بندہ نے خدا کو اپنا کبیر بنا لیا ہے اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنے کو صغیر بنانے پر راضی ہے۔

اللہ اکبر کو قائم کرنے کا محل انسان کے اپنے اندر کی روح ہے نہ کہ کوئی باہر کا ملک یا خارجی زمین۔ اس کا تعلق آدمی کے ایمان سے ہے۔ ایمان ایک شعوری دریافت ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی مظاہر کائنات کے پیچھے حقیقت کائنات کو پالے۔ وہ تخلیق سے گزر کر اس کے خالق کا جلوہ دیکھ لے۔ وہ واقعہ میں صاحب واقعہ کے وجود کا مشاہدہ کرلے۔

اللہ اکبر اسی ایمانی دریافت کا ایک اظہار ہے۔ ایمان آدمی کو ایک عظیم خدا سے متعارف کراتا ہے۔ وہ آدمی کو توحید کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ اس وقت آدمی کی زبان سے کلمۂ اعتراف نکل پڑتا ہے وہ یہی اللہ اکبر ہے۔ اللہ اکبر کا مطلب خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا بنانا ہے۔ اللہ اکبر کے کلمہ کی تکمیل یہ نہیں ہے کہ زمین کے اوپر شریعت کا دیوانی اور فوجداری قانون نافذ ہو جائے۔ اللہ اکبر کے کلمہ کی تکمیل یہ ہے کہ آدمی کی زبان سے جب اللہ اکبر نکلے تو اس کی روح بے اختیار ہو کر کہہ اٹھے کہ انا اصغر (میں چھوٹا ہوں)

"تکبیر رب" کے سلسلہ میں مفسرین کی تشریحات نہایت واضح ہیں۔ ہر ایک نے اس کو نفسیاتی معنی میں لیا ہے نہ کہ سیاسی معنی میں۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند مفسرین کی تشریحات نقل کی جاتی ہیں:

تفسیر ابن کثیر	ولتذكروا الله عند انقضاء عبادتكم (١/٢١٧) لتعظموه كما هداكم لدينه وشرعه وما يحبه ويرضاه ونهاكم عن فعل ما يكرهه ويأباه (٣/٢٢٤)
تفسیر قرطبی	اى عظمه عظمة تامة، صفه بانه اكبر من كل شى (١٠/٣٤٥) اى سيدك ومالكك ومصلح امرك فعظم وصفه بانه اكبر من ان يكون له صاحبة او ولد (١٩/ ٦٠)
تفسیر نسفی	لتكبروا الله اى لتعظموه حامدين على ما هداكم اليه (١/٩٥) واختص ربك بالتكبير وهو التعظيم اى لا يكبر فى عينك غيره (٤/٣٠٧)
تفسیر آلوسی	اى اخصص ربك بالتكبير وهو وصفه تعالىٰ بالكبرياء والعظمة اعتقاداً وقولاً (٢٩/١١٦)
صفوة التفاسیر	اى عظم ربك عظمة تامة واذكر بصفات العز والجلال والعظمة والكمال (٢/١٨٠) اى ولتحمدوا الله على ما ارشدكم اليه من معالم الدين (١/١٢٢)
تفسیر مظہری	اى عظمه عن ان يكون له شريك او ولىّ تعظيما بالغاً (٥/٥٠٤) وصفه باوصاف الكمال ما لا يتصف به غيره (١٠/١٢٤)

مفسرین کی ان تشریحات پر غور کیجئے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام مفسرینِ قرآن کے نزدیک تکبیرِ رب ایک شخصی عبادت کا فعل ہے نہ کہ کوئی سیاسی اور حکومتی فعل۔ جب ایک بندہ اللہ اکبر کہتا ہے تو وہ اپنی معرفت خداوندی کا زبانی اقرار کرتا ہے۔ وہ اللہ کی عظمت اور اس کے احسانات کو یاد کرکے کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا تو ہی بڑا ہے۔ ساری عظمتیں صرف تیرے لئے ہیں۔ میں اپنے عجز کا اور تیری بڑائی کا اقرار کرتا ہوں۔

اللہ اکبر کسی نام نہاد انقلابی نظریہ کا کوئی سیاسی نعرہ نہیں۔ اللہ اکبر دراصل حمد اور شکر کا کلمہ ہے۔ یہ مومن کی قلبی حالت کا ایک لفظی اظہار ہے۔ اس کا تعلق انسان کی اندرونی شخصیت سے ہے نہ کہ کسی خارجی ڈھانچہ یا کسی بیرونی نظام سے۔

سب سے بڑی عبادت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ مومن کا سب سے بڑا سرمایہ یہ ہے کہ وہ خداوند بزرگ و برتر کو اس طرح پائے کہ اس کی شخصیت اس کے جلال و کمال کے تصور سے نہا اٹھے۔ وہ پورے معنوں میں ایک ربانی انسان بن جائے۔ مگر مذکورہ دینی تعبیر میں یہی اہم ترین چیز حذف ہو جاتی ہے۔

خدا کی عظمت ایک قائم شدہ عظمت ہے۔ وہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ مومن جب اس قائم شدہ عظمت کے بارہ میں سوچتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی روح خدا کی بڑائی کے احساس سے بھر جاتی ہے۔ اللہ اکبر کا کلمہ اس کو حمد اور شکر اور انابت کی کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے۔ خدا کو آخری حد تک کامل سمجھنے کا احساس اس کے اندر عبدیت کے جذبہ کو آخری حد تک بڑھا دیتا ہے۔

مگر مذکورہ تعبیر میں ساری صورت حال بدل جاتی ہے۔ جب یہ مان لیا جائے کہ خدا کی بڑائی ابھی ادھوری ہے۔ کچھ انسانوں نے خدا کی بڑائی کے ایک حصہ پر قبضہ کر رکھا ہے تو اب توجہ کا مرکز خدا کے بجائے انسان بن جاتا ہے۔ اب خدا کی قائم شدہ بڑائی میں سرشار ہونے کے بجائے سارا ذہن ان انسانوں کی مخالفت میں لگ جاتا ہے جو خدا کی بڑائی کے ایک حصہ کو مفروضہ طور پر چھینے ہوئے ہیں۔ اور جن سے اس بڑائی کو واپس لے کر ہمیں خدا کی بڑائی کو مکمل کرنا ہے۔ "اللہ اکبر" خدائی بڑائی کے اقرار کا عنوان تھا، مگر اس تعبیر نے اللہ اکبر کو انسانی بڑائی کے انکار کا عنوان بنا دیا۔ ایک عظیم روحانی کلمہ محض ایک سیاسی کلمہ بن کر رہ گیا۔

پہلی صورت میں انسان کا روحانی احساس ابھرتا ہے۔ اور دوسری صورت میں انسان کا سیاسی احساس۔ پہلی صورت میں دین آدمی کے لئے ربانی غذا بن جاتا ہے، اور دوسری صورت میں سیاسی تقریروں اور حکومتی نزاع کا۔ پہلی صورت میں آدمی کے اندر ایک متقیانہ شخصیت ابھرتی ہے اور دوسری صورت میں سیاسی شخصیت۔ پہلی صورت میں آدمی کے اندر خوف خدا کی نفسیات جاگتی ہے اور دوسری صورت میں نفرت انسان کی نفسیات ـــــــ آدمی عین اسی چیز کو کھو دیتا ہے جس کو دراصل اسے اس دنیا میں پانا چاہئے۔

عید اضحیٰ

اس دنیا میں ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا ظاہر، اور دوسرا اس کا باطن۔ جیسے انسان کا ایک ظاہری جسم ہے اور دوسری چیز اس کی روح ہے جو اصل انسان کی حیثیت رکھتی ہے یہی معاملہ اس دنیا میں تمام چیزوں کا ہے۔

اسلام میں جن عبادتوں کی تعلیم دی گئی ہے ان کے بھی اسی طرح دو پہلو ہیں ایک ان عبادتوں کا فارم ہے اور دوسرے ان کی اسپرٹ۔ مثلاً نماز میں قیام اور رکوع اور سجدہ اس کا ظاہری فارم ہے اور اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا ہو۔ اسی طرح روزہ کا فارم، دن کے اوقات میں کھانا اور پانی چھوڑنا ہے اور اس کی اسپرٹ صبر ہے۔ زکوٰۃ کا فارم، اپنے مال کا کچھ حصہ دوسروں کو دینا ہے اور اس کی اسپرٹ عام انسان کے لیے خیر خواہی ہے۔

یہی معاملہ عید اضحیٰ یا عید قرباں کا ہے۔ عید اضحیٰ کی ظاہری شکل دو رکعت نماز اور ذبیحہ ہے اور اس کی اسپرٹ قربانی ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ خدا کو جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کو وہ تقویٰ پہنچتا ہے جو تمہارے اندر ہے۔ تقویٰ سے مراد اندرونی جذبہ ہے یعنی خدا کو یہ مطلوب ہے کہ تمہاری اپنی ذات کے بجائے خدا تمہارا مرکز توجہ بن جائے، دنیا کے بجائے آخرت تمہارا مقصود ہو، مادی ترقی کے بجائے روحانی ترقی کو تم اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بنالو۔

اس طرح کا مقصد محض سادہ عمل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا، اس کے لیے اس قسم کی غیر معمولی جدوجہد درکار ہے جس کو قربانی کہا جاتا ہے۔ قربانی کی سطح پر عمل کر کے ہی آدمی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو پا سکتا ہے، اور آدمی کے اندر قربانی کی اسی اسپرٹ کو جگانے کے لیے اسلام میں عید اضحیٰ کا سالانہ تیوہار رکھا گیا ہے۔

اس قربانی کے عمل کی سب سے پہلی تاریخی مثال حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی، وہ تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں عراق اور دوسری متمدن دنیا میں مادیت اور غیر خدا کی پرستش عام ہو چکی تھی یہ چیزیں تہذیب کا حصہ بن چکی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہ چیزیں اتنا زیادہ سرایت کر چکی تھیں کہ اس ماحول میں جو پیدا ہوتا تھا وہ مادیت سے قریب اور خدا سے دور ہو جاتا تھا۔

انسان فطرت کے راستہ سے ہٹ گیا تھا۔ وہ خواہش پرستی اور توہمات اور خود ساختہ رسم و رواج میں گھرا ہوا تھا اب ضرورت تھی کہ ایک نئی نسل بنائی جائے جس کی اٹھان فطرت کے ابدی اصولوں پر ہوئی ہو۔ جو محدودیت کے خول سے باہر آئے اور آفاقیت کی وسیع تر فضا میں جینے کے قابل بن جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی نئی نسل کی تیاری کے لیے اپنی اولاد کو قربان کر دیا۔ وہ عراق اور شام کے متمدن شہروں سے نکل کر باہر آئے اور اپنے چھوٹے بچے اور ان کی ماں کو غیر متمدن حجاز کے صحرا میں بسا دیا۔ یہاں اس وقت کوئی انسانی آبادی نہیں تھی، اس لیے وہاں وقت کی شہری خرابیاں بھی موجود نہ تھیں۔ اس وقت وہاں صرف فطرت کا ماحول تھا ـــــ پھیلی ہوئی زمین، پہاڑ، درخت، ہوائیں، کھلی فضا، آسمان، سورج، چاند، ستارے، وغیرہ۔ شہروں میں اگر مصنوعی تہذیب کا راج تھا تو اس وقت کے حجاز میں ہر طرف فطرت کی تہذیب کے مناظر پھیلے ہوئے تھے۔

یہ گویا فطرت کی وسیع تعلیم گاہ تھی۔ اسی کے آفاقی ماحول میں اس نسل کی تعلیم و تربیت ہوئی جو بعد کو بنی اسماعیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نئی نسل توالد و تناسل کے ذریعہ تقریباً ڈھائی ہزار سال میں تیار ہوئی۔ اس نسل کا ہر فرد اس اعلیٰ فطرت کا نمونہ تھا جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے ہر فرد میں وہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف پوری طرح موجود تھے جو انسانیت کا کمال سمجھے جاتے ہیں۔

بنو اسماعیل کے انھیں اوصاف کی بنا پر ایک مغربی مورخ نے ان کو ہیروں کی ایک قوم (نیشن آف ہیروز) کا نام دیا ہے۔ فطرت کی درس گاہ میں تعلیم و تربیت پا کر ان میں کا ہر شخص ایک انسانی ہیرو بن گیا۔ چنانچہ انھیں میں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور وہ تمام اعلیٰ انسان بھی اسی نسل کے افراد تھے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قربانی کے ذریعہ جو نئی نسل تیار کی اسی کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے تاریخ انسانی میں نئے دور کا آغاز کیا ـــــ اسی گروہ نے دوبارہ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اوصاف کے نمونے قائم کیے۔ اس نے انسانیت کے قافلہ کو خالق کی پرستش کے راستہ پر ڈالا جو مخلوق کی پرستش میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے انسانیت کو توہمات کے دور سے نکال کر سائنس کے دور میں داخل کیا، اس نے انسانی غلامی کا خاتمہ کیا اور اس بات کو ممکن بنایا کہ انسان آزادی اور مساوات کی فضا میں جی سکے، وغیرہ۔

عید اضحیٰ کا تیوہار ہر سال یہ یاد دلاتا ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کو دوبارہ اسی طرح قربانی کا عمل

کرنا ہے ہر زمانہ میں کچھ لوگوں کو اس مقصد کے لیے اٹھنا ہے کہ وہ قربانی کی حد تک جا کر اصلاح و تعمیر کا عمل انجام دیں۔ وہ انسانیت کے قافلہ کو اس وقت دوبارہ فطرت کی شاہراہ پر لائیں جب کہ وہ اس سے بھٹک گیا ہو۔

عید اضحیٰ کا تیوہار حضرت ابراہیمؑ کی مثالی قربانی یاد دلاتا ہے۔ اس طرح دنیا بھر کے مسلمان علامتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی تقلید کر کے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ حقیقی طور پر حضرت ابراہیمؑ کے طریقہ پر چلیں گے، وہ اپنے زمانہ میں دوبارہ سنتِ ابراہیمی کو ان نئے حالات کے اعتبار سے زندہ کریں گے، تاکہ انسانیت کا قافلہ رکے بغیر ترقی کی سمت میں اپنا سفر جاری رکھے۔

عید اضحیٰ کے موقع پر ذوالحجہ کے مہینہ میں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ حضرت ابراہیم کی قربانی کا ایک علامتی اعادہ ہے۔ حضرت ابراہیم کی اس قربانی والی زندگی کو زیادہ جامع صورت میں حج کے موقع پر حجاز کے علاقہ میں ہر سال دہرایا جاتا ہے جہاں ابتدائی طور پر قربانی کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ حجاز (مکہ) میں یہ عمل کلی طور پر ادا کیا جاتا ہے اور دنیا کے دوسرے مقامات پر انھیں دنوں میں جزئی طور پر۔

عید اضحیٰ کا مقصد یہ ہے کہ قربانی کی یہ اسپرٹ ہر مسلمان کے اندر مسلسل طور پر باقی رہے۔ ہر اگلی نسل کے مسلمان اپنے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق، قربانی کے اس عمل کو دہرائیں۔ وہ بار بار اس ابراہیمی سنت کو زندہ کریں تاکہ انسانیت جمود کی شکار نہ ہو۔ یہ عمل ایک طرف ہر دور میں مسلمانوں کے احیائے نو کا ذریعہ ہے اور دوسری طرف وسیع تر انسانیت کی ضرورتوں کی تکمیل بھی۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی سے ۸ اپریل ۱۹۹۸ کو نشر کی گئی۔

بند شیر

زو (چڑیا گھر) کے اندر لوہے کا اونچا اور مضبوط کٹہرا ہے۔ اس کٹہرے کے اندر ایک زندہ شیر کھڑا ہوا ہے۔ کٹہرے کے باہر کچھ تماشائی اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں شیر قریب آکر گرجدار آواز میں دھاڑنے لگا اس کی دھاڑ کو سن کر ایک بچہ ڈر گیا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اپنی ماں سے چمٹ گیا: ممی، اس کو بھگاؤ۔ لیکن جو بڑے لوگ تھے وہ اپنی جگہ بے خوف کھڑے ہوئے شیر کو دیکھتے رہے۔ انھوں نے اس کی دھاڑ کی کوئی پروا نہیں کی۔

دونوں کے درمیان اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بچہ کا دھیان شیر کی آواز پر گیا اور بڑوں کا دھیان شیر کی محدودیت پر۔ بچہ نے یہ سمجھا کہ شیر جس طرح ہم لوگوں کو دیکھ کر گرج دار آواز نکال رہا ہے، اسی طرح وہ ہمارے خلاف کچھ کر بھی سکتا ہے۔ اس کے برعکس بڑی عمر کے جو مرد اور عورت وہاں موجود تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ شیر خواہ کتنا ہی دھاڑے مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ لوہے کی سلاخوں کو پار کر کے ہم لوگوں تک پہنچ جائے، اس لیے انھوں نے شیر کی خوف ناک دھاڑ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے سادہ طور پر اس کو نظر انداز کر دیا۔

اس مثال کی روشنی میں دور جدید کے مسلم رہنماؤں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے بھی مذکورہ قسم کی صورت حال پیدا ہوئی۔ بہت سے "شیر" مسلمانوں کے خلاف دھاڑنے لگے۔ تاہم یہ سب کے سب بند شیر تھے نہ کہ کھلے شیر۔ مگر بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما "بچہ" کی مانند ثابت ہوئے۔ وہ اس معاملہ میں بڑے لوگوں والا کردار ادا نہ کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان اٹھانا پڑا جس کا شمار کرنا بھی ممکن نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مشرق سے لے کر مغرب تک تمام ملکوں میں ایسے افراد اٹھے جنھوں نے اسلام یا مسلمان کے خلاف لفظی طوفان برپا کیا ایسے لوگ ہندوؤں میں بھی تھے اور عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی۔ ان لوگوں کے مخالفانہ الفاظ جب پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ پھیلے تو دنیا بھر کے مسلم رہنماؤں نے جوابی تحریکیں شروع کر دیں انھوں نے مسلمانوں کو ڈرایا کہ دیکھو، ساری دنیا میں تمہارے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ یہ دشمن تمہارے تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ تمہارے ملّی وجود کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔

مسلم رہنماؤں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو بھڑکا دیا۔ اب دنیا بھر کے مسلمان جہاد کے نام پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ کہیں یہ سرگرمیاں منفی سوچ تک محدود رہیں اور کہیں انھوں نے تشدد کا روپ اختیار کر لیا۔

ان مسلم تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ منفی سوچ ہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی غالب سوچ بن گئی۔ وہ غیر مسلموں کو اپنا دشمن سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔ اس نفرت کا مزید نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جو لوگ عالمی امن اور بین اقوامی رواداری کی بات کرتے تھے یا دوسری قوموں سے خوش گوار تعلقات قائم کرنے پر زور دیتے تھے وہ سب مسلمانوں کی نظر میں معتوب ہو گئے۔ وہ انھیں دشمن قوموں کے ایجنٹ نظر آنے لگے۔

اس طرح موجودہ زمانہ کے مسلمان نہ صرف غیر مسلموں سے لڑنے بھڑنے میں مصروف ہو گئے بلکہ خود اپنی قوم کے اعتدال پسند لوگوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر ان کے خلاف بھی جنگ چھیڑ دی۔ یہ دوطرفہ جنگ آج دنیا کے ہر حصہ میں کم و بیش جاری ہے۔ کہیں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اور کہیں خود مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان۔

مفروضہ دشمنوں کے خلاف ہونے والی اس نام نہاد لڑائی میں یک طرفہ طور پر خود مسلمانوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اب مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کو ساری دنیا میں ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ اس کے خلاف شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرنے لگے۔ دشمنان اسلام کی ظلم و زیادتی کا اعلان کرنا تقریری اور تحریری جہاد کے ہم معنی بن گیا۔

لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس معاملہ کی مکمل ذمہ داری خود نااہل مسلم رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ مذکورہ مثال کے مطابق، شیر کی دھاڑ کے مقابلہ میں وہ صرف بچہ ثابت ہوئے، اس معاملے میں وہ بڑے آدمی کا رول ادا نہ کر سکے۔

بطور واقعہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلم قوموں میں کچھ ایسے افراد اٹھے جنھوں نے اسلام یا مسلمانوں کے خلاف تقریریں کیں یا کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ایسی تحریکیں چلائیں جن کو بظاہر اینٹی مسلم تحریک کہا جا سکتا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں کو جاننا چاہیے تھا کہ یہ شخصی بادشاہت کا زمانہ نہیں ہے، یہ آزادی اور جمہوریت اور حقوق انسانی کے عالمی اعتراف کا زمانہ ہے۔ آج کی دنیا ایک گلوبل ولیج ہو چکی ہے،

اب اقوام متحدہ کا طاقت ور ادارہ قائم ہے۔ جدید علمی اور فکری انقلاب نے دنیا بھر کے بیشتر لوگوں کی نظر میں کٹرپن اور تشدد کو قابل نفرت چیز بنا دیا ہے، وغیرہ۔

اس طرح کے مختلف عالمی اسباب موجودہ زمانہ کے بھیڑیوں اور شیروں کے لیے گویا ایک مضبوط آہنی کٹہرا بن چکے تھے۔ یہ جدید حالات حتمی طور پر اس میں مانع تھے کہ کوئی بھی شخص یا تحریک مسلمانوں کو کوئی حقیقی نقصان پہنچا سکے۔ اس قسم کے دشمن اپنی منفی آوازوں سے مسلمانوں کی سمع خراشی تو کر سکتے تھے مگر وہ ان کے خلاف کسی جارحانہ اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ ایک لفظ میں یہ کہ اس قسم کی تحریکیں مسلمانوں کے لیے صرف ایک بے ضرر ازعاج (nuisance) تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی واقعی خطرہ۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کا کام وہ نہ تھا جو انھوں نے کیا۔ ان کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو بتاتے کہ موجودہ زمانہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا زمانہ ہے اس قسم کے تمام لوگ زیادہ سے زیادہ فضا میں کچھ لفظی کثافت بکھیر سکتے ہیں، وہ تمہارے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ تم ان کے معاملہ میں اسلامی تعلیم کے مطابق اعراض کا طریقہ اختیار کرو، تم ان کے لفظوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا تعمیری اور دعوتی کام جاری رکھو۔ اپنے آپ کو جدید پہلو سے زیادہ سے زیادہ مستحکم بناؤ۔ تم دوسروں سے الجھے بغیر اپنے ترقیاتی کاموں میں مصروف رہو۔

مگر بدقسمتی سے مسلم رہنما اس صورت حال کی اصل نوعیت کو نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے انتہائی غیر ضروری طور پر مسلمانوں کو ٹکراؤ کے راستہ پر لگا دیا جس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے کامل طور پر یہ موقع تھا کہ وہ "کٹہرا" سے باہر رہ کر اپنی تعمیر و ترقی کا کام انجام دیں مگر اپنے رہنماؤں کی بے بصیرت رہنمائی کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ وہ پر جوش چھلانگ لگا کر خود کٹہرے کے اندر داخل ہو گئے۔ بند شیر تو ان کے قریب نہیں آسکتا تھا مگر انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو شیر تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک المناک صفحہ بن چکا ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا (آل عمران ۱۲۰)

اس آیت کے مطابق، تقویٰ اور صبر کی روش گویا وہ آہنی روک ہے جو دشمن کو ہم سے دور رکھتی

ہے۔ یہ روش اس بات کی ضمانت ہے کہ ہم دشمن کی سازشوں کی زد میں آنے سے محفوظ رہیں گے۔ مگر جب مسلمان تقویٰ اور صبر کی روش چھوڑ دیں تو اس کے بعد ان کے اور ان کے دشمن کے درمیان کوئی روک باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد ان کی مثال اس انسان جیسی ہو جاتی ہے جو کسی زو میں لوہے کی سلاخوں کو پار کر کے اپنے آپ کو شیر کے پاس پہنچا دے۔

اس طرح چھلانگ لگانے والا انسان اگر بعد کو یہ چیخ و پکار بلند کرے کہ یہ شیر بڑا ظالم ہے، اس نے مجھے پھاڑ ڈالا تو یہ شکایت صرف اپنی نادانی کا اشتہار ہو گی۔ اس کے برعکس ایسے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی نادانی کا اعتراف کرے نہ کہ شیر کو مجرم قرار دے کر اس کے خلاف بے فائدہ طور پر شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرنے میں مشغول ہو جائے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے اسی امتحان کی بنا پر یہاں ہر ایک کو پوری آزادی بھی دی گئی ہے۔ یہاں بسنے والے ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو چاہے مثبت کام میں استعمال کرے یا منفی کام میں۔

اس صورت حال نے موجودہ دنیا کو ایک قسم کا جنگل بنا دیا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے آپ کو دوسروں کی زیادتی سے محفوظ رکھنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ قرآن کے مطابق، تقویٰ اور صبر ہے۔ تقویٰ اور صبر ایک اور دوسرے کے درمیان فطرت کی مقرر کی ہوئی آڑ ہے، جو لوگ اس آڑ کو باقی رکھیں وہ دوسروں کی زیادتیوں سے محفوظ رہیں گے۔ اور جو لوگ اس آڑ کو اپنی نادانی سے توڑ ڈالیں، وہی وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی ظلم و زیادتی کا شکار ہوئے۔

لیک بعد از خرابیٔ بسیار

فارسی شاعر کا ایک شعر ہے کہ —— جو کچھ دانش مند آدمی کرتا ہے وہی بے دانش آدمی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دانش مند پہلے کرتا ہے، اور بے دانش آدمی بعد کو اس وقت کرتا ہے جب کہ معاملہ ناقابل اصلاح حد تک بگڑ چکا ہو:

آں چہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

موجودہ زمانہ میں ہندستان کے لیڈر، ہندو اور مسلمان دونوں مکمل طور پر مذکورہ فارسی شعر کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ دونوں ہی نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ معاملات کو پیشگی طور پر نہیں سمجھتے، وہ اس کو صرف اس وقت سمجھتے ہیں جب کہ معاملات بگڑ چکے ہوں اور حالات کو درست کرنے کا موقع بہت کم باقی رہ گیا ہو۔

قیادت، مستقبل کی منصوبہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ قائد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کا اقدام بظاہر حال کے اندر ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے اس لیے قائد کو لازماً دور اندیش اور مستقبل بیں ہونا چاہیے۔ جن لوگوں کے اندر دور اندیشی اور مستقبل بینی کی صفت نہ ہو انھیں چاہیے کہ وہ قیادت کے میدان میں نہ اتریں بلکہ اپنی سرگرمیوں کے لیے اس کے سوا کوئی اور میدان تلاش کریں۔ بدقسمتی سے ہندستان کی قیادت، ہندو اور مسلم دونوں، اس اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کا سیاسی غلبہ تھا اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے درمیان ایسے قائد اٹھے جنھوں نے انگریزی راج کے خاتمہ کو ملک کی تمام ترقیوں کا راز بتایا۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ لوگوں کو یہ پیغام دیا کہ سیاسی غلامی تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور سیاسی آزادی تمام خوبیوں کا سرچشمہ۔ انھوں نے قوم کو یہ جذباتی نعرہ دیا کہ —— غلامی یا آزادی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو:

Slavery or freedom, choose between the two.

پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے سیکڑوں ہندو اور مسلمان لیڈر اس زمانہ

میں اسی قسم کی تقریریں کیا کرتے تھے مگر بعد کے تجربہ نے بتایا کہ یہ نظریہ درست نہ تھا۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان انگریزوں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوگیا مگر پچاس سال سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ "آزاد ہندستان" نہ بن سکا جس کا خوش نما نقشہ ان ہندو اور مسلم لیڈروں نے ملک کے لوگوں کو دکھایا تھا۔

آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے ہندستان میں کچھ ایسے اہلِ فکر تھے جو یہ کہتے تھے کہ ہماری پہلی ضرورت تعلیم ہے۔ پہلے قوم کو تعلیم یافتہ بناؤ، تاکہ وہ آزادی کو صحیح طور پر استعمال کر سکے۔

مسلمانوں میں اس سلسلہ میں ایک معروف نام سر سید احمد خاں کا ہے۔ وہ بھی آزادی چاہتے تھے مگر وہ تعلیم کو آزادی پر مقدم کرتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کو مولانا الطاف حسین حالی نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

سر سید کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایسے کئی لوگ اٹھے جو تعلیم کو مقدم کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں میں مدن موہن مالویہ اور سر تیج بہادر سپرو کا نظریہ یہی تھا۔ مگر نہرو اور آزاد جیسے لوگوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ ان کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ صرف اس وقت ہوا جب کہ ان کی تحریک اپنی آخری حد تک پہنچ گئی اور ہندستان سیاسی معنوں میں آزاد ہوگیا۔

چنانچہ آزادی کے بعد جب مذکورہ قسم کے لیڈروں نے ملک کا نیا دستور بنایا تو اس کی دفعہ ۴۵ میں یہ درج کیا کہ اسٹیٹ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ دس سال کے اندر تمام اہلِ ملک کو پڑھا لکھا بنا دے مگر یہ ایک رومانی دفعہ تھی نہ کہ کوئی حقیقی دفعہ۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی زمیندار اپنے کھیت میں بونے کے وقت دانہ نہ بوئے اور جب فصل کاٹنے کا وقت آجائے اور اس کو نظر آئے کہ میرا کھیت خالی پڑا ہوا ہے، تو وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے کہ تم لوگ دس دن کے اندر یہاں لہلہاتی ہوئی فصل اگا دو۔ ظاہر ہے کہ زمیندار کا یہ حکم کبھی واقعہ نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ہندستانی لیڈروں کا یہ دس سالہ دستوری منصوبہ بھی واقعہ نہ بن سکا۔

آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو کا مسئلہ تھا۔ یہاں ملک کے بے بصیرت قائدین نے دوبارہ ایک اور شدید تر غلطی کر ڈالی۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کی اقتصادیات کو سوشلزم کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ ۱۹۵۵ء میں مدراس کے کانگریسی اجلاس میں اس فیصلہ کو سوشلسٹ نمونہ کا سماج

(سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی) کا نام دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین جس زمانہ میں سوشلزم (اشتراکیت) کو اقتصادی تعمیر کی معراج کمال سمجھ رہے تھے اسی زمانہ میں راقم الحروف اپنی وہ کتاب تیار کر رہا تھا جو بعد کو مرتب ہو کر "مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے" کے نام سے شائع ہوئی۔ سوشلزم یا (مارکسزم) کے بارے میں اول دن سے میری یہ رائے تھی کہ وہ ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ موجودہ دنیا میں وہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ کیوں کہ اقتصادی ترقی مسابقت کے کھلے ماحول میں ہوتی ہے نہ کہ ریاستی کنٹرول کے بند ماحول میں۔ مگر ہمارے سیاسی قائدین اس نظریہ کے بارے میں خوش خیالی کی حد تک پر امید بنے ہوئے تھے انھوں نے ہندستان میں سوشلسٹ سوسائٹی بنانے کے لیے قومی دولت کا کھربوں ڈالر اقتصادی پلاننگ کے نام پر ضائع کر دیا۔

ان لیڈروں کی آنکھ صرف اس وقت کھلی جب کہ چالیس قیمتی سال بیت گئے اور ملک میں کوئی حقیقی ترقی نہ ہو سکی۔ چنانچہ اب سوشلسٹ اکانومی (صحیح تر لفظ میں کنٹرولڈ اکانومی) کے بجائے لبرل اکانومی کا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ مگر ملک کی اقتصادی حالت اب اتنی زیادہ بگڑ چکی ہے کہ بظاہر طویل مدت تک اس کے درست ہونے کی کوئی امید نہیں۔

اب مسلم لیڈرشپ کی ایک مثال لیجئے۔ ایودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہوا تو راقم الحروف نے مسلسل یہ لکھا کہ اس مسئلہ کو لوکل دائرہ میں محدود رکھا جائے اور پر امن گفت وشنید یا عدالت کے ذریعہ سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے مگر نااہل مسلم قیادت نے اس کو دھوم کا مسئلہ بنایا۔ ایودھیا کی مسجد کے نام پر سارے ملک میں دھواں دھار تحریک چلا دی گئی اس کے نتیجہ میں ہندوؤں کے جذبات بھڑک اٹھے یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندوؤں کی ایک بھیڑ ایودھیا میں اکٹھا ہوئی اور اس نے بابری مسجد کو ڈھا کر ایک عارضی مندر بنا دیا۔

اس کے بعد نااہل مسلم لیڈروں نے دوبارہ "مسجد وہیں بناؤ" کے نام پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد ہونے لگے پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی فصل اگ آئی۔ اس وقت راقم الحروف نے سنگین رسک لے کر یہ اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اب اس مسئلہ پر چپ ہو جائیں، وہ مندر اور مسجد کے سوال کو ایودھیا ہی میں ختم کر دیں۔

اس وقت لوگ اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے میری بات کو نظر انداز کر دیا۔ خاص طور پر مسلمانوں کا اردو پریس اس معاملہ میں زرد صحافت کا بدترین نمونہ بن گیا اس نے میرے خلاف جھوٹے الزامات عائد کر کے مجھ کو اتنا زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی کہ اس کی مثال صحافت کی پوری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ مگر آج کیا حال ہے آج تمام مسلمان خواہ اصاغر ہوں یا اکابر، بے ریش طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہوں یا باریش طبقہ سے، ہر ایک وہی کر رہا ہے جس کا مشورہ میں نے دسمبر ۱۹۹۶ میں دیا تھا. یعنی ہر ایک چپ ہے۔ ایک عرصہ تک لفظی دھوم مچانے کے بعد اب ہر ایک نے اس موضوع پر لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے اور بولنا بھی۔

اب ایک اور ورق الٹیے — جنوری ۱۹۹۳ میں ورندابن میں وہاں کے گیتا آشرم میں ایک آل انڈیا سیمنار ہوا۔ اس میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور آر ایس ایس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے ان کی دعوت پر میں نے بھی اس سیمنار میں شرکت کی (ملاحظہ ہو سفرنامہ الرسالہ نومبر ۱۹۹۳)

اس موقع پر میں نے ایک مفصل تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں ہندستان اور پاکستان کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد پاکستان میں کچھ لوگوں نے اسلامی اسٹیٹ قائم کرنے کے نام پر تحریک چلائی۔ اسی طرح ہندستان میں کچھ لوگوں نے ہندو اسٹیٹ کو اپنا نشانہ بنایا۔ مگر میرے نزدیک یہ دونوں ہی قسم کی تحریکیں صرف وقت اور طاقت کے ضیاع کے ہم معنی ہیں۔ کیوں کہ سادہ طور پر وہ موجودہ حالت میں قابل عمل ہی نہیں۔ یہ دونوں تحریکیں بظاہر مختلف ہونے کے باوجود اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہیں، اور جو چیز اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہو اس کو اس وقت تک قائم کرنا ممکن نہیں جب تک کہ خود زمانہ کا مزاج ہی بدل نہ جائے۔ حکومتی نظام عمومی حالات کے تابع ہے نہ کہ کچھ افراد کی خواہشات کے تابع۔ کسی بھی حکومتی نظام کے لیے سب سے پہلے اس کے موافق حالات بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومتی نظام شعوری تبدیلی کی زمین پر قائم ہوتا ہے نہ کہ محض حکمرانوں کی تبدیلی کی زمین پر۔

میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں صرف سیکولر اسٹیٹ ہی قابل عمل ہے اس لیے آپ لوگوں کو ہندتو کا نعرہ چھوڑ کر سیکولرازم کا نعرہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر آپ اس کو اپنے ارادی فیصلہ کے تحت نہ کریں تو حالات کے دباؤ کے تحت ایسا کرنا پڑے گا۔ ورندابن کے مذکورہ سیمنار میں

کسی نے میری تائید نہیں کی۔ ایک ہندو پروفیسر نے اپنی لمبی تقریر میں شدت کے ساتھ اس کا کھنڈن کیا۔

مگر فروری ۱۹۹۸ آیا تو تاریخ بدل چکی تھی ہندستان کے جنرل الکشن (فروری۔ مارچ ۱۹۹۸) میں حالات کا ایسا شدید دباؤ پیش آیا جس کے مقابلہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو اپنا سیاسی وجود خطرہ میں نظر آنے لگا۔ ۱۹۹۳ میں انھوں نے جس بات کو دلیل کے ذریعہ نہیں مانا تھا، ۱۹۹۸ میں انھوں نے اس کو سیاسی دباؤ کے تحت مان لیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۹۸ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے جو نیا نیشنل ایجنڈا شائع کیا گیا ہے اس میں ہندتو کا لفظ حذف کر کے سیکولرزم کا لفظ لکھ دیا گیا ہے اگرچہ شرمندگی مٹانے کے لیے اس میں سیکولرزم کے بجائے جینوئن سیکولرزم تحریر کیا گیا ہے۔

۱۹۹۷ کے آخر میں جب بارھویں لوک سبھا کے الکشن کا چرچا شروع ہوا تو میں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈروں کو یہ پیغام دیا کہ آپ لوگ اپنے الکشن مینی فیسٹو میں تین نزاعی اشو (کامن سول کوڈ، ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر، دفعہ ۳۷۰) کو شامل نہ کیجئے۔ آپ لوگ اپنے مینی فیسٹو میں صرف ان اشوز کو لیجئے جو نیشنل اشوز کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس وقت وہ لوگ اتنے جوش میں تھے کہ میری بات انھیں قابل لحاظ نظر نہ آئی۔ چنانچہ انھوں نے جو طویل مینی فیسٹو شائع کیا اس میں ان تینوں اشوز کو شامل کر دیا۔

مگر جب وہ الکشن کے میدان میں اترے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ تنہا الکشن کو جیت نہیں سکتے۔ چنانچہ انھوں نے دوسری پارٹیوں سے گفت وشنید شروع کی اور ۱۳ پارٹیوں کو ساتھ لے کر ایک متحدہ محاذ بنایا یہ پارٹیاں صرف اس شرط پر اتحاد میں شرکت پر راضی ہوئیں کہ مذکورہ تینوں اشوز کو مینی فیسٹو سے نکال دیا جائے۔ چونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پاس کوئی اور متبادل موجود نہ تھا، وہ اس حذف پر راضی ہو گئی۔ دوبارہ یہی ہوا کہ جن لوگوں کے لیے دلیل کی منطق ناکافی ثابت ہوئی تھی عملی دباؤ کی منطق نے ان کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔

یہ پچھلے تقریباً سو سال کی سیاسی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ ہمارے لیڈر، ہندو اور مسلمان دونوں بار بار سیاسی بصیرت کے میدان میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ پیش بینی اور دور اندیشی کامیاب قیادت کی لازمی صفات ہیں مگر اس امتحان میں ہمارا کوئی بھی لیڈر پورا اترتا نظر نہیں آتا، نہ کوئی ہندو اور نہ کوئی مسلمان۔ یہی وجہ ہے کہ سو سال کی ہنگامہ آرائیوں اور ان گنت قربانیوں کے باوجود ابھی تک وہ ہندستان نہ بن سکا جس کا خواب ملک کے دردمند لوگوں نے دیکھا تھا۔

اس المیہ کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں کود ے، مگر ان کو سیاست کا یہ ابتدائی اصول معلوم نہ تھا — کہ سیاست ممکنات میں عمل کرنے کا فن ہے :

Politics is the art of the possible.

انسان کے دماغ میں بڑی بڑی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں تخیلات کا ایک فرضی محل تیار کرتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی آدمی کے الفاظ کبھی تاریخ نہیں بنتے۔ عمل کی دنیا میں صرف وہ چیز واقعہ بنتی ہے جس کے حق میں واقعات کی موافقت موجود ہو۔ ہمارے لیڈر، ہندو اور مسلمان دونوں اپنے تخیلات میں جی رہے تھے۔ وہ خارجی دنیا کے حقائق سے باخبر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی طوفان خیز سرگرمیوں کے باوجود وہ حقیقی معنوں میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ موجودہ اسباب کی دنیا میں صرف حقائق واقعہ بن سکتے تھے نہ کہ کسی کے خوش کن تخیلات — یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری قومی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے نئے عنوان کے تحت ہم اپنی قومی تاریخ کا نیا باب شروع کر سکتے ہیں۔
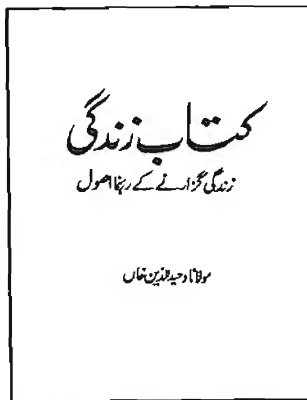
Size 22×14.5cm, pages 232
Rs. 40
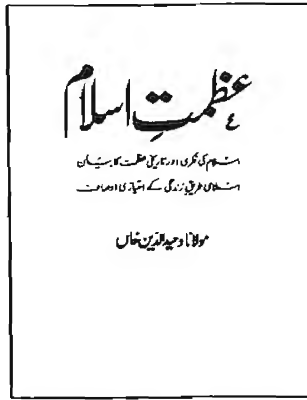
Size 22×14.5cm, pages 292
Rs. 50
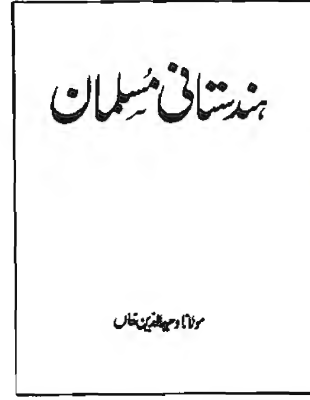
Size 22×14.5cm, pages 252
Rs. 55

۱۔ نئی دہلی میں لاس اینجلس ٹائمس (امریکی ڈیلی) کے بیورو چیف مسٹر ڈکسٹر فلکنس (Dexter Filkins) نے ۲۱ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کی سیاست سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کٹر ہندو جماعت موجودہ الکشن میں اگر برسر اقتدار آجائے تو وہ اجودھیا کی بابری مسجد کی طرح دوسری مسجدوں کو بھی گرانا شروع کر سکتی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی سوچ کیا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس قسم کا تباہ کن واقعہ تاریخ میں قابل اعادہ نہیں ہوتا۔ آپ ایٹم بم کو بار بار نہیں گرا سکتے۔

۲۔ انورت بھون (نئی دہلی) میں ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ لوگوں میں روحانیت اور اخلاق کیسے پیدا کیا جائے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۳۔ ایک امریکی ادارہ نان وائلنس انٹرنیشنل کے تحت واشنگٹن میں ۶۔۷ فروری ۱۹۹۸ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور نان وائلنس کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ اس کی تفصیل إن شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ اسلامک اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (دہلی) کے تحت ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع الکشن اور ہندستانی مسلمان تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ آخر میں سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ یہ جلسہ ۲۱ فروری ۱۹۹۸ کو ہوا۔

۵۔ سنڈے میگزین (کلکتہ) کے نمائندہ مسٹر این وی سبرانیم نے ۶ مارچ ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ زمانہ کے مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم نوجوانوں میں تشدد کا جو رجحان ابھرا ہے اس کا تعلق اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے۔ یہ بعض مسلم رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔

۶۔ پرولائف میگزین (نئی دہلی) کی خاتون نمائندہ مسز انوکما بھٹاچاریہ نے ۱۰ مارچ ۱۹۹۸ء

کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اس سے تھا کہ زندگی کیا ہے اور انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔

۷۔ ہفت روزہ پانچ جنیہ کے سب ایڈیٹر مسٹر شرما نے ۱۱ مارچ ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے مسلمان آج بھی دیش کی مکھیہ دھارا میں ہیں۔ مگر اخباروں میں چونکہ مثبت خبروں کی رپورٹنگ بہت کم ہوتی ہے اس لیے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر نہیں۔ لوگ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اخبار میں چھپتا ہے۔ حالانکہ اخبار میں جو کچھ چھپتا ہے وہ اصل سماجی صورت حال کا بمشکل ایک فیصد ہوتا ہے۔

۸۔ ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) نے مرکز میں نئی پارٹی کی حکومت کے قیام پر مختلف لوگوں کے انٹرویو لیے۔ اس بارے میں اس نے صدر اسلامی مرکز کا بھی انٹرویو لیا۔ یہ اخبار کا شمارہ ۲۲ مارچ ۱۹۹۸ میں اسپشل رپورٹ کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ صدر اسلامی مرکز کے ایک جواب کو اخبار نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

Unlike the general impression Maulana Wahiduddin dismisses the suggestion that Muslims are a scared lot under the BJP regime. "The BJP is like a caged lion. It can roar but can do no harm because of historical, political, economic, social and international compulsions. And, more important, because the majority of the majority community is extremely secular" says the Maulana (p. 19)

۹۔ رہتک (دیانند مٹھ) میں ۲۵ مارچ ۱۹۹۸ کو آریہ سماج کی طرف سے ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع —— شراب بندی تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور وہاں شراب کے بارے میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ شراب کو اسلام میں ام الخبائث قرار دیا گیا ہے، یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ کسی سماج کو اگر برائیوں سے پاک کرنا ہے تو اس کے اندر سے شراب نوشی کو ختم کرنا ضروری ہے۔

۱۰۔ ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ یہ سیرت کے موضوع پر ہے اس میں سیرت کا علمی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ "مطالعۂ سیرت" کے نام سے شائع ہوگی۔ دو اور کتابیں زیر طبع ہیں —— اسلام کیا ہے، سفرنامہ اسپین و فلسطین۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	55/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	65/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	2/-
فکرِ اسلامی	50/-
طلاق اسلام میں	3/-
دین انسانیت	60/-

شتمِ رسول کا مسئلہ	40/-
مطالعۂ سیرت	–
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرہویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	–
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویرِ ملت	85/-
دعوتِ اسلام	50/-
دعوتِ حق	40/-
نشری تقریریں	65/-

اسفارِ ہند	–
اسلام ایک تعارف	–
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	–
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	–
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	–
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	–
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوش	8/-
پوتر جیون	8/-

A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	85.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	—
An Islamic Treasury of Virtues	—
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	85.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	125.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	—
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00